بنگلہ دیش میں بارہ دن

عتیق صدیقی

بنگلہ دیش
میں
بارہ دن

قومی ایکتا ٹرسٹ نئی دلی

© مصنّف

مئی ۱۹۷۲ء

قیمت

مطبوعہ نیو پبلک پریس دہلی

پیش لفظ

عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کے باضابطہ قیام کے تین ہی مہینے بعد اپریل ۱۹۷۲ء میں، بنگلہ دیش جانے اور وہاں بارہ دن قیام کرنے کا مجھے موقع ملا۔ آگے آنے والے صفحات میرے اسی سفر کے تاثرات و تجربات ہیں۔

اردو میں سیاسی مسایل کو عموماً، اور مسایل حاضرہ کو خصوصاً، تصنیف و تالیف کا مستقل موضوع بنانے کی روایت چوں کہ اب تک قایم نہیں ہو سکی ہے، اس لیے میری ہی طرح آپ کے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا شاید آسان نہ ہو کہ بنگلہ دیش میں بارہ دن سیاسی سفر نامہ ہے یا رپورتاژ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے رپورتاژ کا نام دینا زیادہ قرین صحت ہوگا۔

عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش ہمارے ملک کی طرح برصغیر ہند کی ایک اہم اکائی ہے۔ اسے اپنا وجود منوانے میں غیر معمولی جد و جہد ہی نہیں، باقاعدہ جنگ

پس منظر
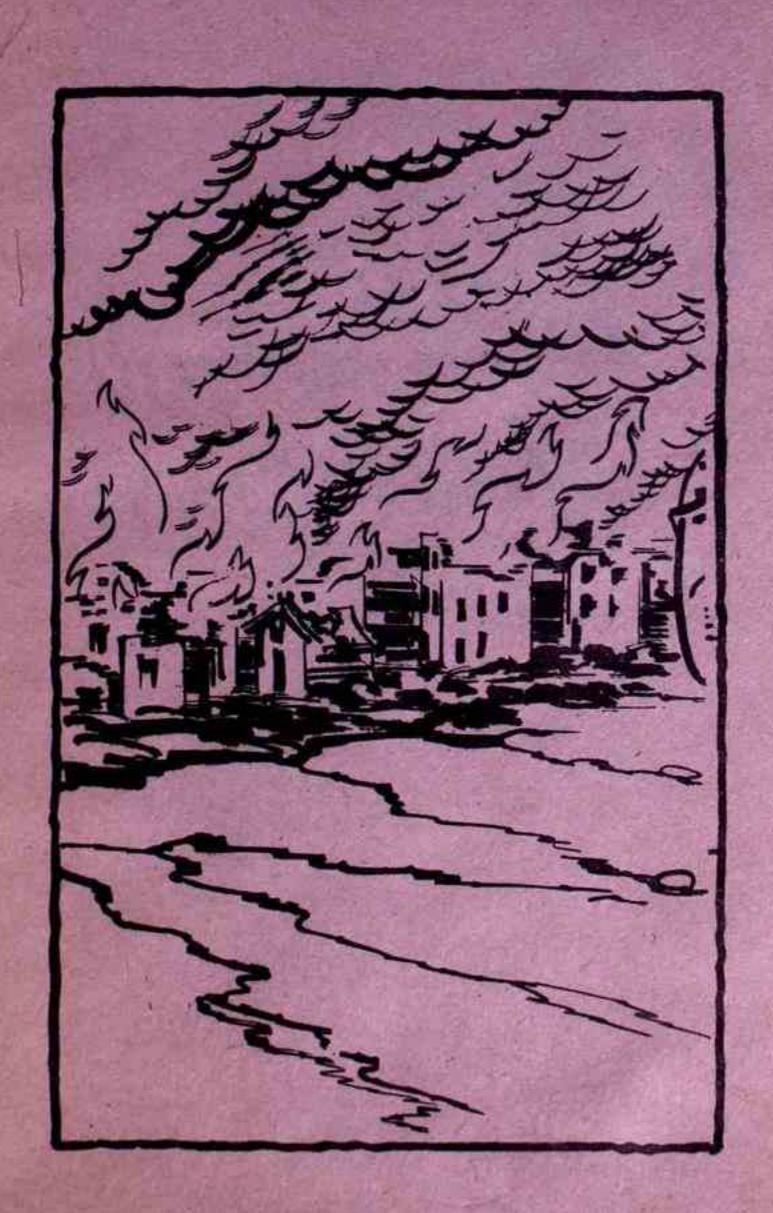
آج کو سمجھنے کے لئے، خواہ وہ کسی فرد کا ہو یا قوم کا، گزرے ہوئے کل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بنگلہ دیش کل تک پاکستان کا حصہ تھا، لیکن آج، آزاد و خود مختار مملکت ہے، اور اس حقیقت سے پاکستان کا ہر فرد —— ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر جمن اور کلن تک بہ خوبی واقف بھی ہے، مگر بعض نفسیاتی اسباب کی بنا پر اسے تسلیم کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ یہی نفسیاتی اسباب تھے جن کی بنا پر، بہ قول صدر بھٹو "امریکا نے روس کی حکومت کو تیس سال تک اور چین کی حکومت کو تو آج تک تسلیم نہیں کیا ہے۔"

صدر بھٹو کا یہ طرزِ عمل قطعاً حیران کن نہیں ہے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح اگر زندہ ہوتے تو تقسیم پاکستان کو دیکھ کر قدرتی طور پر ان کا ردعمل بھی وہی ہوتا جو عام پاکستانیوں کا ہوا ہے۔

لیکن یہ سن کر لوگوں کو آج شاید حیرت ہو کہ قیام پاکستان کے وقت مسٹر جناح کو مشرقی بنگال سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔

تقسیم ہند کے سلسلے میں جب پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا سوال سامنے آیا تو غیر منقسم بنگال کے مسلمان اور ہندو لیڈروں نے، جن میں شہید سہروردی اور سرت چندر بوس کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، یہ اسکیم بنائی کہ بنگال کو تقسیم کرنے کی جگہ پر اسے متحد رکھ کر ایک آزاد و خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا جائے۔ اس اسکیم کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ ہمارے

موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اس قصے کا یہ پہلو ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق رکھتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب یہ تجویز مسٹر جناح کے سامنے رکھی، تو ان کا تاثر یہ تھا:

"اگر ایسا ہوا، تو مجھے خوشی ہوگی۔ کلکتہ اگر نہیں ملتا ہے تو [مشرقی] بنگال سے کیا فایدہ! وہ دونوں [مشرقی و مغربی بنگال] اگر متحد رہیں تو بہتر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے ساتھ بھی ان کے تعلقات دوستانہ رہیں گے۔"

مسٹر جناح کا یہ نقطۂ نظر مسلم لیگ کے اجلاس لاہور (۱۹۴۰ء) کی اس تجویز کے بھی، بڑی حد تک، مطابق تھا، جو آگے چل کر ہماری تاریخ میں "تجویز پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تجویز کے مطابق مسلم اکثریت کے علاقوں کی دو آزاد و خود مختار ریاستوں کی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا تھا ـــــ ایک شمال مغرب میں اور دوسری شمال مشرق میں۔ لیکن یہ حیرت ناک ہے کہ قیام پاکستان کے وقت اس تجویز کو یک سر نظر انداز کیا گیا اور دو ریاستوں کی جگہ پر ایک ہی ریاست پاکستان کے نام سے قائم کی گئی۔ یہی غلطی "تقسیم پاکستان" کی اصل بنیاد بن گئی۔

ہندستان کے آخری انگریز گورنر جنرل اور تقسیم ہند کے خالق لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قیام پاکستان کے کچھ ہی دنوں بعد جب اپنے جانشین راج گوپال آچاریہ سے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان پچیس سال بھی پاکستان کے ساتھ نہ رہ سکے گا، تو شاید ان کے پیش نظر بھی مسلم لیگ کی یہی غلطی تھی۔ لیکن 'مسلم بنگال' کے 'مسلم پاکستان' سے مکمل طور پر الگ ہونے کے اور بھی بہت سے اسباب تھے، جنہیں سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ پیچھے کی طرف جانا ہوگا۔

علاحدگی پسندی کے جو رجحانات مشرقی بنگال میں پیدا ہوئے، یا جو پاکستان کے باقی ماندہ علاقوں ـــــ خصوصاً صوبہ سرحد، بلوچستان اور کچھ حد تک سندھ میں بھی سر اٹھا رہے ہیں حقیقتاً

وہ تقسیم سے پہلے کے دس برسوں (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۷ء) کی اس مسلم سیاست کا ردعمل ہیں جس کی عمارت مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے ہی پر کھڑی کی گئی تھی۔ اس سیاست کے سوتے نہ تو فکر کی گہرائی سے پھوٹے تھے اور نہ اس کی بنیاد عقلیت پسندی کا فلسفہ ہی تھا۔ اس کے حدود اس جگہ سے شروع ہوئے تھے جہاں سے عقل کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ اس دور کی مسلم سیاست کا سب سے بڑا ستون، بلکہ واحد ستون، "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ تھا، جو کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کے ذہن پر چھا گیا۔

اس سیاست کا یہ پہلو بھی خاصا دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ اسلام کے نام کو آلۂ کار بنانے میں وہ مسلم قیادت کامیاب ہوئی جو ہئیت، فکر اور عمل کے اعتبار سے قطعاً غیر مذہبی واقع ہوئی تھی اور جسے اسلام سے عملاً دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس کی بہترین مثال بانیِ پاکستان خود محمد علی جناح کی ذات تھی۔

بہرکیف اسی غیر اسلامی "مسلم قیادت" نے اسلام کی دہائی دے کر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی شرکت کی راہیں روکیں اور عزت و شرف کی اس زندگی سے انھیں محروم کر دیا، جس کے متحدہ آزاد ہندستان میں وہ جائز طور پر حقدار ہو سکتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی گزشتہ چوبیس برسوں میں اس "سلطنت خداداد" پاکستان کی حیات کا ضامن اور وہاں کے سیاسی و معاشی بنیادی مسائل کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے اسلام ہی کے نام کو اسم اعظم سمجھا گیا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے قبائلی علاقوں کی بمباری ہو، یا پنجاب میں احمدیوں کا قتل عام، سب کچھ اسلام ہی کے نام پر کیا گیا۔ اس کی انتہائی بھیانک اور اسی درجہ عبرتناک مثال مرحوم "مشرقی پاکستان" میں ملتی ہے، جہاں بہیمانہ قتل و غارت اور عصمت دری

کی وہ قیامت بھی اسلام ہی نام پر برپا کی گئی جس کی دوسری مثال اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی اور جس کے سامنے ہلاکو، چنگیز، اور ہٹلر کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ پچھلی چودہ روزہ جنگ کے دوران تو پاکستان کی فوجی آمریت نے اسلام ہی کو فریق بنا کر پیش نہیں کیا، بلکہ خدا کو بھی سپاہی کی وردی پہنا کر میدان کارزار میں اتار دیا اور دنیا کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ پاکستان کی شکست اسلام کی شکست ہے۔ اسلام کی اس تحقیر و تذلیل پر جو پاکستان سے ہاتھوں ہوئی:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

پاکستان کی سالمیت کے خاتمے کا رونا رونے والے اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ مغربی و مشرقی پاکستان کے جغرافیائی کردار اور طبعی ماحول کے تضاد کے علاوہ ان دونوں علاقوں کے رہنے والوں کے رہن سہن کے ڈھنگ، کھانے پینے کی عادتوں، مذاق، طبائع، عادات و خصائل، رنگ و نسل اور زبان و بیان میں مشرق و مغرب کے فرق نے پاکستان کی سالمیت کو مصنوعی ہی نہیں، بلکہ غیر فطری بنا دیا تھا اور اس کا ہیولا پکار پکار کر زبان حال سے کہہ رہا تھا:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی!

پاکستان کے دونوں بازوؤں میں، جو ایک دوسرے سے دو ہزار کلو میٹر کی دوری پر واقع تھے، اسلام یقیناً مشترک تھا لیکن قومیت کی تشکیل کے بنیادی عناصر کا بدل وہ نہیں بن سکتا تھا۔ قیام پاکستان کے گیارہ سال بعد، اور تقسیم پاکستان سے تیرہ سال قبل، مولانا آزاد نے 'انڈیا ونس فریڈم' (India Wins Freedom) میں لکھا تھا:

"یہ کہنا عوام کو بہت بڑے فریب میں مبتلا کرنا ہے کہ صرف مذہب کا مشترک ہونا دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتا ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار

سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو، لیکن تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ابتدائی چند دہائیوں کو، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی بھی تمام مسلم ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر ایک ریاست میں متحد نہ کر سکا۔

"یہ صورت حال ماضی میں تھی اور آج بھی یہی ہے۔ کوئی بھی یہ امید نہیں کر سکتا کہ مغربی و مشرقی پاکستان کے رہنے والے اپنے تمام اختلافات دور کر کے ایک قوم بن سکیں گے۔"

مولانا آزاد نے جن بنیادی حقائق کی طرف اشارہ کیا تھا، ان سے قطع نظر، پاکستان کی تاریخ ــــ ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کی تاریخ ــــ اٹھارویں صدی کے ہندستان کی طرح، سیاسی و معاشی طوائف الملوکی کی تاریخ رہی ہے، جسے پاکستان کے من چلے سیاسی و فوجی قسمت آزماؤں کے عروج و زوال کی عبرت ناک داستان ہی کہا جا سکتا ہے۔ پھر ان چوبیس برسوں میں مغربی پاکستان ہی کی قیادت پورے پاکستان پر چھائی رہی جو رجعت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ تنگ نظر بھی تھی، اور اس نے مشرقی پاکستان کو سیاسی و معاشی استحصال کے لئے اپنی جاگیر سمجھا۔

پاکستان کے مشرقی بازو میں لسانی و ثقافتی استحصال کے خلاف جدوجہد قیام پاکستان کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہوئی۔ یہ بھی ایک دل چسپ اتفاق تھا کہ بانیِ پاکستان ہی کی ایک تقریر اس جدوجہد کی محرک بنی۔ قیام پاکستان کے سات ہی مہینے بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح نے ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری و قومی

زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ بنگالیوں نے حیرت آمیز سکوت کے ساتھ اس اعلان کو سنا، جو اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ پاکستان کے ارباب اختیار اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ ان کے ملک کی اکثریت بنگلہ زبان بولتی ہے جو علمی و ادبی اعتبار سے بھی پنجابی، پشتو، سندھی اور مہاجر اردو سے بھی زیادہ سرمایہ اپنے اندر رکھتی ہے، اور یہ کہ بنگالیوں کو اپنی زبان سے جنون کی حد تک محبت ہے۔ دو دن بعد جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے خطبۂ تقسیم اسناد میں بھی مسٹر جناح نے اس اعلان کا اعادہ کیا تو ہال میں احتجاج کی ایک لہر سی دوڑ گئی، جس کی وسعت و گیرائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانوکیشن کے جلوس کی رسمی واپسی کو منسوخ کر کے مسٹر جناح کو پیچھے کے ایک دروازے سے باہر نکالا گیا۔ اس احتجاج نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی تحریک کی شکل اختیار کر لی کہ دو سال بعد پاکستان کی حکومت کو اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ کو بھی قومی و سرکاری زبان تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن یہ جھگڑا اسی جگہ ختم نہیں ہوا۔ جلد ہی روز افزوں معاشی استحصال کے عفریت نے سر اٹھایا۔ مشرقی پاکستان کے چائے کے باغات اور پٹسن کے کھیت اگرچہ پاکستان کے زرمبادلہ کی مجموعی کمائی کا دو تہائی سے زیادہ حاصل کرتے تھے، لیکن اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ مشرقی پاکستان کی ترقی و خوش حالی کی اسکیموں پر خرچ نہ ہوتا۔ آمد و خرچ کے اس عدم توازن نے مشرقی و مغربی پاکستان کے باہمی رشتوں کے توازن کو بھی درہم برہم کر دیا۔ یہی قضیہ مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام تک پہنچا۔ اسی پروگرام کی بنا پر ۱۹۷۰ء میں عوامی لیگ نے پاکستان کے پہلے عام انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

بنگلہ دیش کا قیام برصغیر ہند کے مسلمانوں کو اسی منزل پر لے آیا ہے، جو ان کے سیاسی سفر کی راہ میں آج سے پینتیس سال قبل، ۱۹۳۷ء میں، اس وقت آئی تھی جب گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ملک میں عام انتخابات ہوئے تھے، جس کے نتیجے میں محدود رائے دھندگی کے باوجود، کانگریس کو ہندستان کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ اس صورت حال سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ ہندستان کی آزادی کی منزل اب دور نہیں رہی اور ہندستانی مسلمانوں کے سامنے ایک ایسا موڑ آگیا تھا، جہاں سے دو راہیں نکلتی تھیں۔ ایک طرف جدوجہد آزادی کی شاہراہ تھی جو اور قوموں کے دوش بہ دوش کھڑے ہونے اور مشترک قومی زندگی کی تشکیل میں ایک موثر اور فعال عنصر بننے کی مسلمانوں کو بھی دعوت دے رہی تھی۔ دوسری طرف خود اعتمادی اور فکر و عمل کے فقدان کی پگڈنڈی تھی، جو برطانوی استعمار کی چھاؤنی اور علاحدگی پسندی کی منزل کی طرف ان کی رہنمائی کرتی تھی۔ اس دور کی مسلم قیادت راجوں، نوابوں اور اسی قسم کے دوسرے خطاب یافتہ سیاسی و مذہبی گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے طبقاتی مفاد برطانوی استعمار کے خاتمے سے نہیں بلکہ استحکام سے وابستہ تھے۔ آزادی کی جدوجہد اور مشترک قومی زندگی کی تعمیر کی روشن شاہراہ سے اس نے آنکھیں پھیر لیں اور "یا علی" کا نعرہ لگاکر علاحدگی پسندی کی پگڈنڈی پر چل پڑی۔ اس کی آخری منزل تقسیم ہند تھی، جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو طے ہوگئی۔

راہ کے انتخاب میں مسلم قیادت نے جو غلطی ۱۹۳۸ء میں کی تھی، وقت اور تاریخ نے آج تک اسے معاف نہیں کیا ہے۔ برصغیر عموماً اور اس کی مسلم آبادی خصوصاً، ابھی تک اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ اس برصغیر میں، تقسیم ہند سے لے کر تقسیم پاکستان تک مسلمانوں کی جتنی بھی تباہی و بربادی اس برصغیر میں ہوئی، وہ بڑی حد تک ہندستانی مسلم قیادت کی اسی بنیادی غلطی کے تاوان کی قسطیں تھیں، اور آخری قسط کی ادائیگی شاید ابھی باقی ہے۔

یہ حقیقت جتنی جلد تسلیم کرلی جائے اسی قدر بہتر ہے کہ مذہب کو بنیاد بنا کر قومیت کی تعمیر کا جو تجربہ کیا گیا تھا وہ سرے سے غلط تھا۔ ایک ہی مذہب مختلف علاقوں کے بسنے والوں میں تو مشترک ہو سکتا ہے اور مختلف جغرافیائی ماحول میں رہنے والوں کی روحانی تسکین کا بھی وسیلہ بن سکتا ہے، لیکن مختلف علاقوں کے بسنے والوں اور مختلف جغرافیائی ماحول میں رہنے والوں کو ایک قومیت کی لڑی میں پرو نہیں سکتا۔ پاکستان میں قومیت کے تجربے کی ناکامی کی ذمہ داری مذہب پر نہیں بلکہ مذہب کی غلط تعبیر پر ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس حقیقت کو آج بھی افسانہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'مسلم بنگال' کی پاکستان سے علاحدگی کے بعد بھی مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی صحت اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ تقسیم ہند کا مسئلہ جب بھی زیر بحث آتا ہے، تو اکثر اصل سوال سے گریز کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ "یہ کانگریس ہی تو تھی جس نے دو قومی نظریہ تسلیم کر لیا تھا"۔ یہ بات اول تو صحیح نہیں ہے اور صحیح بھی ہو تو اس سے دو قومی نظریے کی صحت تو ثابت نہیں ہوتی۔ کانگریس نے تقسیم ہند کو جس بنا پر بھی تسلیم کیا ہو، یہ اس کی غلطی اور بہت بڑی غلطی تھی اور یہ کانگریس پر کوئی نیا اعتراض بھی نہیں ہے۔ تقسیم کے عمل میں آنے سے دو مہینے پہلے تقسیم کے فیصلہ کی تصدیق کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا، اس میں یہی اعتراض انتہائی تند و ترش لہجے میں متعدد مقرروں نے دہرایا تھا، جن میں مرحوم مولانا حفظ الرحمان کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے ـــــ اور تقسیم کی تجویز متفقہ طور پر پاس بھی نہیں ہو سکی تھی۔

اسی سوال پر کچھ لوگوں نے کانگریس سے الگ ہو کر اکھنڈ بھارت کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ اور کنہیا لال منشی کی قیادت میں ایک پارٹی بھی بنائی تھی، لیکن کانگریس کو چوں کہ ایک طرف تو آزادی حاصل کرنے کی جلدی تھی اور دوسری طرف انگریز کے ساتھ ساتھ اس زہر آلود مسلم سیاست سے

بھی وہ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی، جو تمام تر منافرت پر مبنی تھی، اس لئے مخالفین کی چیخ و پکار کو نظر انداز کر کے کانگریس نے تقسیم کو قبول کر لیا۔

اس تقسیم کو کانگریس نے جن وجوہ کی بنا پر بھی قبول کیا ہو، مسلم لیگ کے دعوے کے مطابق وہ دو قومی نظریے ہی کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی۔ یہ دو قومی نظریہ اقبال کے اس فلسفے پر مبنی تھا کہ "قوم"، صرف "مذہب" سے بنتی ہے اور "قوم از وطن است"، کو وہ "بولہبی" کے مرادف سمجھتے تھے۔ شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مرحوم نے اس خیال سے جب اختلاف کیا تو اقبال نے حیرت کے ساتھ کہا

حسین احمد ز دیوبند ایں چہ بوالعجبی ست!

اقبال کے اسی تصور کی بنیاد پر مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اور ان سے دو ہزار کلومیٹر کی دوری پر رہنے والے پنجابی، سندھی، بلوچی، اور سرحدی پٹھانوں کو مذہب کے اشتراک کی وجہ سے "ایک قوم"، سمجھ لیا گیا اور ان کے نسلی، لسانی اور ثقافتی اختلاف کو فروعی سمجھ کر سرے سے نظر انداز کیا گیا۔ لیکن تقسیم کے معاہدے کی روشنائی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ عملی تجربے نے یہ حقیقت منکشف کر دی کہ مذہب، قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا، اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں مذہب کی اگر کوئی حیثیت ہو سکتی ہے تو صرف ثانوی ہو سکتی ہے۔ اس کے اصلی اجزائے ترکیبی نسلی، لسانی ثقافتی اور جغرافیائی رشتے ہوتے ہیں۔ برصغیر ہند سے قطع نظر کر کے مغربی ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی مثالوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ مسئلہ زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے۔

مصر انیسویں صدی کے اوائل تک عثمانی حکومت کا حصہ تھا، لیکن محمد علی پاشا نے لڑ بھڑ کر اپنے ہم مذہب ترکوں سے علاحدگی اختیار کی۔ سوڈان اور مصر دونوں اسلامی ملک ہیں، ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور دونوں کی زبان بھی عربی ہی ہے۔ کل تک سوڈان مصر کا ایک صوبہ تھا لیکن آج ایک آزاد و خود مختار مملکت ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل کردستان بھی عثمانی حکومت ہی کا جزو تھا۔ معاہدہ وارسائی نے اس کے تین ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ایران کو دے دیا گیا، دوسرا عراق کو اور تیسرا ترکی ہی کے قبضے میں رہا۔ ایرانیوں، عراقیوں اور ترکوں کی طرح کرد بھی مسلمان ہی ہیں، لیکن نسلی، لسانی اور ثقافتی اختلاف کی وجہ سے وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور کم و بیش نصف صدی سے ان کی آزادی کی جد و جہد جاری ہے۔

فلسطین کو لیجئے جس کی سرحدیں اردن سے ملتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں برطانوی ڈپلومیسی نے جب فلسطین کو یہودیوں اور مسلمانوں میں تقسیم کیا تو "مسلم فلسطین" کو "مسلم اردن" سے ملا دیا۔ لیکن فلسطینیوں نے آج تک اس صورت حال کو قبول نہیں کیا۔ اردن کی فوجوں اور فلسطینی چھاپہ ماروں کی جھڑپوں کی جو خبریں ہم آئے دن پڑھتے ہیں وہ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔

"مذہب" اگر "قومیت" کی تشکیل کا جزو اعظم بن سکتا تو نہ مصر عثمانی حکومت سے علیحدہ ہوتا، نہ سوڈان مصر سے، نہ کرد ایران، عراق و ترکی سے الگ ہونے کی جد و جہد کرتے، اور نہ فلسطین اردن کے ساتھ رہنے سے انکار کرتا۔ ان مثالوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات شاید بہ آسانی سمجھ میں آسکے کہ حقیقتاً "قوم از وطن است" اور "مذہب" کو "قومیت" کی بنیاد قرار دینا بوالہجبی ہے۔

"پاکستان صحیح بنا تھا یا غلط؟" — برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کے ذہن میں اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ تو کبھی تھا اور نہ شاید آج ہے، مگر یہ ان کی خواہش ضرور تھی کہ اب جب کہ پاکستان بن گیا ہے، چاہے وہ غلط بنا ہو یا صحیح، اسے قائم رہنا چاہئے۔ لیکن چوبیس سال تک پاکستان کا جزو بنے رہنے کے بعد مشرقی بنگال کے پاکستان سے جدا ہو جانے کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت یہ سمجھنے لگی ہے کہ پاکستان غلط بنا تھا اور مسائل اس سے حل نہیں ہوئے بلکہ اور الجھ گئے، مگر اس کا علانیہ

اعتراف کرنے کے لئے ابھی وہ تیار نہیں ہے۔ اس میں اسے اپنی سبکی محسوس ہوتی ہے۔ بعض ہندستانی دوستوں نے، جنہیں آج بھی پاکستان کے ساتھ ہمدردی ہے، بنگلہ دیش کے قیام کے بعد یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندستان نے مغربی پاکستان کو بھی ختم کر کے پورے ملک کو پھر سے اگر ایک کر دیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔

قیام پاکستان کے باب میں ہندستان، اور پاکستان میں بھی، بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ انگریز چوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے عادی تھے، اس لئے یہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ ملک تقسیم کر گئے۔ پاکستان انگریزوں کا عطیہ ہے جو ہندوؤں کی دشمنی میں مسلمانوں کو دے گئے۔

قیام پاکستان کے یہ اسباب نہایت سطحی اور انتہائی عامیانہ ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ پاکستان کا وجود برطانوی ڈپلومیسی ہی کا رہینِ منت ہے، لیکن یہ حقیقت ہے جس سے ہندستان کی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے کہ انگریز کو نہ تو مسلمانوں سے کسی قسم کا لگاؤ تھا اور نہ ہندوؤں سے کوئی لاگ تھی۔ اس کے پیش نظر صرف برطانوی سامراجی مفاد تھا۔ اس نے رخصتی "تحفے" کے طور پر مسلمانوں کو پاکستان نہیں بخشا بلکہ یہ نئی مملکت اس نے جائے پناہ کے طور پر تراشی تھی۔

تقسیم ہند کو قبول کرنے پر کانگریس کیوں آمادہ ہو گئی؟ اس کے متعدد سیاسی اور غیر سیاسی اسباب تھے۔ ان ہی میں ایک سبب ہندستان اور بیرون ہند کے ماہرین اقتصادیات کا یہ خیال بھی تھا کہ معاشی و مالی اعتبار سے پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے گا اور چند سال کے تجربے کے بعد اسے پھر ہندستان کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا۔ اس وقت ان کے درمیان چوں کہ انگریز نہ ہوگا اس لئے کانگریس اور مسلم لیگ میں حقیقت پسندانہ سمجھوتہ ہو سکے گا۔ یہ بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔ اس تجزیے کے مطابق کانگریس نے تقسیم کو مسائل کا ایک عارضی حل سمجھ کر قبول کیا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد ایک نئی اور انوکھی عالمی ڈپلومیسی کا ظہور ہوا، جس کا اس وقت تک دنیا کو تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس نئی ڈپلومیٹک

پالیسی کے تحت بڑی طاقتوں نے ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں کو اتنی کثیر مالی امداد دینے کی پالیسی اختیار کی، جو ان کے سارے کاروبار ریاست کی کفیل ہو سکے۔ اس نئی حکمت عملی نے ہندستان کی طرف پاکستان کی بازگشت کی راہیں بند کر دیں۔

اسی بحث کے سلسلے میں پُرکارانہ سادگی سے کام لے کر یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ "پاکستان اگر برطانوی سیاست گری کی پیداوار تھا تو برطانیہ پاکستان کی حمایت سے کیوں دست کش ہو گیا، اور کیوں گزشتہ چوبیس سال میں پاکستان کے ساتھ دوستی کا حق ادا نہ کر سکا اور بنگلہ دیش کی حمایت میں پورا برٹش پریس، بی بی سی، لیبر پارٹی کے تمام اراکین اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کی اکثریت کیوں امنڈ پڑی؟" اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ "پاکستان انگلستان کا اگر عطیہ ہوتا تو پھر برطانیہ پاکستان کا اتحادی و حلیف بن کر اس کی سالمیت کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا۔" یہ بات ظاہر الگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور عوام کے ذہن کو الجھن میں ڈال کر گم راہ بھی کر سکتی ہے۔ لیکن گزشتہ چوبیس سال کی عالمی سیاست کی روشنی میں اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ الجھن آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان جب تقسیم ہوا تو اس سے دو سال پہلے جنگ عظیم عملاً ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مابعد جنگ کی عالمی سیاسی صورت غیر واضح تھی۔ اتحادی طاقتوں کے تین بڑے ارکان امریکا، روس اور برطانیہ تھے۔ اور ان تینوں کے درمیان عالمی تفوق اور بالادستی کے لئے مقابلہ شروع ہونا قدرتی تھا۔ اتحادی ارکان ثلاثہ میں سب سے کمزور حیثیت برطانیہ کی تھی۔ اختتام جنگ کے بعد روس اور امریکا کے اقتدار میں تو اضافہ ہوا لیکن برطانیہ کے ہاتھ سے اس کی مشرقی سلطنت بھی نکل گئی۔ اس کے نتیجے میں جو خلار مشرق کی سیاسی زندگی میں پیدا ہوا، اسے پُر کرنے کے لئے روس اور امریکا میں دوڑ شروع ہوئی۔ نو آزاد ملکوں میں عرض و طول ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ سیاسی اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بھی چوں کہ برصغیر ہند ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، اس لئے وہی روس و امریکا کی توجہ کا مرکز بنا۔

پاکستان ایک ایسی مملکت تھی جس کا اپنا کوئی ماضی نہ تھا۔ اس کے برعکس ہندستان ایک شان دار ماضی کا مالک تھا اور ماضی قریب میں اس نے آزادی کی جو جدوجہد کی تھی، دنیا اس واقف تھی۔ گاندھی اور نہرو روشناس عالم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے نام چوتھائی صدی سے دنیا کی زبان پر چڑھے تھے اور ہر جگہ عزت و احترام سے ان کا ذکر کیا جاتا تھا۔ یہی بات بڑی حد تک مولانا آزاد کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے، جو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے تھے ہندستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کا یہی چوں کہ آخری اور اہم ترین عہد تھا، اور برطانوی کیبنٹ مشن سے گفت و شنید بھی مولانا آزاد ہی نے کی تھی، اس لئے دنیا ان کے نام سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ پاکستان کے پاس اس طرح کی کوئی شخصیت نہیں تھی جو روشناس عالم ہوتی۔ دنیا نے بانیِ پاکستان محمد علی جناح کا نام ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ضرور سنا تھا، لیکن جنگ آزادی کے مجاہد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک علاحدگی پسند سیاست داں اور اس برطانوی سامراج کے حلیف کی حیثیت سے جو ہندستان کی جدوجہد آزادی کا حریف تھا۔

ہندستان کے پاس ایک آزمودہ کار، مخلص اور مضبوط قیادت بھی تھی، جس سے پاکستان یک سر محروم تھا۔ محمد علی جناح کو اگر الگ کر دیا جائے تو پاکستان کی مسلم لیگ قیادت، خواہ وہ مقامی رہی ہو یا مہاجر، راجوں، نوابوں اور برطانوی خطاب یافتوں پر مشتمل تھی۔ صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے سابق کانگریسی کارکن جو اپنے وطن ہی میں رہ گئے تھے اور جنہوں نے ایمان داری کے ساتھ پاکستان کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا، اس کمی کو دور کر سکتے تھے، لیکن انھیں پاکستان دشمن اور مردودِ وطن گردان کر، قومی سیاست سے الگ تھلگ ہی رکھا گیا، بلکہ ان کے حصے میں قید و بند کی زندگی آئی۔ اس کی روشن مثال خان عبدالغفار اور عبدالصمد خاں اچک زئی ہیں۔

پاکستان کی دوسری اور شاید سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ مخلص سیاسی قیادت کی

طرح مخلص سول سروس بھی اسے نصیب نہ ہو سکی۔ پاکستان کی سیاسی قیادت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہاں کی سول سروس حکومت پر قابض ہو گئی اور اس کے ہر فرد نے اس "سلطنت خداداد" کو اپنے لئے تحفہ خداوندی سمجھا۔ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے پاکستانی فوجی سروس بھی سول سروس کی حلیف بن گئی۔ اس نے پاکستان کی قومی و سیاسی زندگی کی طوایف الملوکی کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد اس ملک کو ایک بھی ایسا وزیر اعظم یا صدر مملکت نصیب نہ ہو سکا، جسے عوامی زندگی یا تحریک پاکستان سے کوئی عملی تعلق رہا ہو۔ ناظم الدین، سہروردی اور فضل الحق تو پاکستان کے افق پر ضرور نمودار ہوئے، لیکن شہاب ثاقب کی طرح، جن کا عدم اور وجود یکساں ہی رہا۔ اور پھر ان تینوں کی جو آبرو ریزی ہوئی وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ہندستان و پاکستان کی سیاسی صورت حال کے اسی بین فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ سابق اتحادی حلیفوں نے جب برصغیر میں سیاسی بالادستی حاصل کرنے کی دوڑ شروع کی، تو ان دونوں میں سے کسی کا بھی حلیف بننے سے ہندستان اپنا دامن بچا لے گیا۔ لیکن پاکستان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ سول اور فوجی سروسوں کے اقتدار حاصل کرنے سے قبل پاکستان کی سیاسی قیادت چوں کہ جاگیردار اور نو زائیدہ سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھ میں رہی جنہیں رجعت پرست اور احیا پسند مذہبی گروہوں کی حمایت بھی حاصل تھی، اس لئے اشتراکی روس کے ساتھ پاکستان کا ناتا جوڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔ رہ گئے امریکا اور برطانیہ۔ مالی اعتبار سے برطانیہ پاکستان کو وہ امداد دے ہی نہیں سکتا تھا، جس کی اسے بے اندازہ ضرورت تھی۔ پاکستان کی اسی احتیاج نے دنیا کے مالدار ترین ملک امریکا کو اس کی قومی زندگی میں دخیل ہی نہیں کیا، بلکہ شریک غالب بنا دیا۔ قیام پاکستان کے بعد، ابتدائی چند برسوں میں امریکا اور برطانیہ کے درمیان رسہ کشی رہی۔ لیاقت علی خاں

کا قتل بھی امریکا اور برطانیہ کی باہمی رقابت ہی کا نتیجہ تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد اور اسکندر مرزا بھی برطانوی مہرے ہی تھے، لیکن فیلڈ مارشل ایوب نے برسر اقتدار آتے ہی برطانوی سیاست کی بساط ہی الٹ دی اور پاکستان کو برطانیہ کے پہلو سے اٹھا کر امریکا کی گود میں بٹھا دیا۔ لیکن تجارتی اعتبار سے پاکستان خصوصاً مشرقی پاکستان، برطانیہ ہی سے منسلک رہا۔ وہاں کے چائے کے باغات برطانیہ کے ہی قبضے میں رہے اور پٹسن کی برآمد پر بھی اسی کا قبضہ رہا، جس کی بدولت اس کے ڈانڈی کے کارخانے چلتے رہے۔ امریکا نے اگر پاکستان کو مالی امداد، سامان حرب اور ادنا ضروریات زندگی سے لے کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹ، موٹر، رفریجیریٹر اور ہوائی جہاز تک فراہم کیے تو برطانیہ پاکستان کے خام مال کا، جو تمام تر مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا تھا، ٹھیکے دار بن گیا۔ اس طرح سے پاکستان کی سیاسی زندگی میں برطانیہ اگر شریک غالب نہیں تو شریکِ ثانی تو بنا ہی رہا۔

یہ خیال کہ گزشتہ چوبیس برسوں میں برطانیہ نے پاکستان کے ساتھ دوستی کا حق ادا نہیں کیا، حقائق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ یو این او اور سیکورٹی کونسل میں جب بھی کشمیر کا سوال آیا، امریکا کے ساتھ ساتھ برطانیہ نے بھی پاکستان ہی کا ساتھ دیا۔ بلکہ اس نے آج تک ہندوستان کے موقف کو علانیہ تسلیم بھی نہیں کیا ہے۔ یہی بات پختونستان کے مطالبے کی بابت بھی کہی جا سکتی ہے۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے ابتدائی دور میں بی بی سی اور برطانوی پریس نے پاکستان ہی کی جانب داری کی۔ یہی حال برطانوی حکومت کا بھی تھا۔ لیکن جلد ہی حالات کی روش نے برطانوی حکومت پر جب یہ حقیقت واضح کر دی کہ اب پاکستان کسی قیمت پر بھی مشرقی بنگال کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا، تو برطانوی نشری اداروں اور برطانوی اخبارات کی روش بدل گئی اور ان سب نے بنگلہ دیش کی جانب داری شروع کر دی۔ لیکن سیکورٹی کونسل میں جب یہ مسئلہ آیا تو پاکستان یا بنگلہ دیش کی حمایت کرنے کی جگہ یہ برطانیہ نے غیر جانب داری کی روش اختیار کی۔ برطانیہ اور پاکستان کے تعلقات کی تاریخ میں یہ اپنی

نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ چناں چہ اسی زمانے میں خود بی بی سی نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں اپنی ہندی سروس میں کہا تھا کہ "چوبیس سال میں پہلی بار برطانیہ نے اپنے لاڈلے پوس پالک پاکستان کا ساتھ نہیں دیا"۔ برطانیہ کی اسی غیر جانب داری پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سیکورٹی کونسل ہی میں مسٹر بھٹو نے برطانیہ کو مخاطب کر کے ملامت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ "تم سے اچھا تو روس ہی رہا جس نے ایک موقف تو اختیار کیا، خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو" اسی تقریر میں مسٹر بھٹو نے اس امر کی طرف بھی کھل کر اشارہ کیا تھا کہ برطانوی غیر جانب داری کی پشت پر مشرقی بنگال کے چائے کے باغات اور پٹسن کا مفاد کام کر رہا ہے۔

مسٹر بھٹو کا یہ تجزیہ سو فیصدی صحیح تھا۔ برطانیہ ایک حقیقت پسند تاجر قوم ہے، جو اپنے مفاد کے تحفظ اور اسی کی بقا کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہے اور ضرورت ہو تو اپنے مفاد کی دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے "اپنے لاڈلے پوس پالک" کو بھی قربان کر سکتی ہے۔ چناں چہ برطانیہ کو جب یقین ہو گیا کہ مشرقی پاکستان اب پاکستان سے الگ ہو کر ہی رہے گا۔ تو مشرقی بنگال کے چائے کے باغات اور وہاں کے پٹسن کی پیداوار پر قابض رہنے کے لئے اس نے "اپنے لاڈلے پوس پالک" کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور یہی نہیں بلکہ صدر بھٹو کی انتہائی منت و سماجت کے باوجود بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کرنے میں چند روز کا توقف بھی گوارا نہ کیا۔

پاکستان کا قیام ہو یا پاکستان کی سالمیت کی شکست و ریخت، سارے برطانوی اقدامات حقیقت پسندی کے فلسفے پر مبنی تھے۔ آپ اسے خود غرضی کا نام دیجئے یا مفاد پرستی سے تعبیر کیجئے لیکن حقیقت پسندی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، برطانوی قومی کردار کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس برصغیر کے مسلمانوں کی سادہ لوحی کی سب سے زیادہ عبرت ناک مثال خود تحریک پاکستان تھی، جسے کامیاب بنانے کے لئے، ایک بیان کے مطابق وہ تمام سیاسی حربے استعمال کئے گئے جو

عام طور سیاست میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کی سادہ لوحی سے ان کے جذبات یہ تھے "کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ علاقہ بن جائے گا تو وہاں ان کے مذہب، ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو عام مسلمانوں کے ذوق اور مزاج کے مطابق فروغ ہوگا۔ جس کو صاف الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہاں اسلام، اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی۔ یہ خیال صحیح تھا یا غلط؟ اس سے بحث نہیں، مگر اس وقت پاکستان کی تحریک کے علم برداروں کے جذبات یہی تھے۔"

بنیادی سوال ہی کو خارج از بحث قرار دینا بھی سادہ لوحی کی ایک اچھی مثال ہے۔ سوال تو یہی ہے کہ مسلمانوں نے پاکستان کے ساتھ جو تصور وابستہ کر لیا تھا، وہ غلط تھا یا صحیح؟ بانیِ پاکستان محمد علی جناح بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ ہندستانی مسلمان اپنی سادہ لوحی سے، پاکستان کے ساتھ جو تصور وابستہ کر رہے ہیں وہ غلط ہے، ناممکن العمل ہے لیکن اسے وہ اگر واضح کر دیتے تو ان کا سارا کھیل ہی بگڑ جاتا، چناں چہ تجویزِ پاکستان (مارچ ۱۹۴۰ء) سے لے کر قیامِ پاکستان (اگست ۱۹۴۷ء) تک "حضرت قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ" نے کبھی بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ پاکستان کا خود ان کے ذہن میں کیا تصور ہے؟ یا یہ کہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت ہوگی؟ وہاں کا دستور جدید جمہوری طرز کا ہوگا یا فتاوائے عالمگیری پر مبنی ہوگا؟

بنگلہ دیش کے قیام نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ پاکستان ہی میں نہیں کسی بھی مسلم ملک میں "اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب" کا احیاء اسی درجہ ناممکن ہے جتنا کہ ہندستان میں ہندو زندگی اور ہندو تہذیب کے احیاء کی کوشش ناممکن الحصول ہے۔ پاکستان میں جماعت اسلامی اور دوسری احیاء پسند جماعتوں نے، مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں میں اخوان المسلمین نے اور ہندستان میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور دوسری احیائی تنظیموں نے سر مار کر دیکھ لیا، لیکن مذہبی زندگی اور مذہبی تہذیب کے احیاء کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

یہ اقبالؔ کی آرزو تھی اور احیار پسند دل و دماغ رکھنے والے کسی بھی انسان کی آرزو ہو سکتی ہے۔ لیکن بقول حسرتؔ :

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں!

حیرت ہے کہ فلسفی ہونے کے باوجود اقبالؔ کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ زمانہ ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا ہے اس کا "پیچھے کی طرف" دوڑنا قانون قدرت کے منافی ہے۔ اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ سیکولر بنگلہ دیش کے ظہور نے "اسلامی پاکستان" میں اور ریاستی اسمبلیوں کے حالیہ انتخابات کے نتائج نے "ہندو ہندستان" میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ آج کی دنیا میں مذہبی زندگی اور مذہبی تہذیب کا احیار ناممکن ہے۔

'آج' کے بنگلہ دیش نے گزرے ہوئے 'کل' کے تجربے اور گرد و پیش کے حالات سے فائدہ اٹھا کر احیا پرستی اور پیچھے دوڑنے کی جگہ پر اپنے دستور کی بنیاد سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کے اصولوں پر رکھی ہے، جو حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ بنگلہ دیش کا یہ اقدام پاکستان کے لیے بھی قابلِ تقلید مثال بن سکے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ پاکستان ہی کے لیے نہیں، پورے برصغیر کے لئے شگون نیک ثابت ہوگا۔

بنگلہ دیش میں بارہ دن

۱

ڈھاکہ جانے کے لیے ۲۶ مارچ کو دہلی سے روانہ ہوا۔ یہ بھی اتفاق تھا، محض اتفاق ــ مگر ایک بامعنی اور دل چسپ اتفاق ــ کہ پچھلے سال ۲۶ مارچ ہی کو بنگلہ دیش کی آزادی کے کارواں نے اپنے سفر کی اس منزل کو خیرباد کہا تھا، جہاں دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد وہ پہنچا تھا ــ وہ انتخابات جو پاکستان کی چوبیس سالہ تاریخ کے پہلے عام انتخابات تھے۔ اسی مناسبت سے بنگلہ دیش کی حکومت نے ۲۶ مارچ کی تاریخ کو اپنا قومی دن قرار دیا ہے۔

اخبارات سے جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ قومی دن بنگلہ دیش میں بڑے جوش و خروش سے منایا جانے والا ہے، تو میری خواہش ہوئی کہ ۲۴ یا ۲۵ مارچ کو میں ڈھاکہ پہنچ جاؤں۔ لیکن دہلی یا کلکتہ سے ہوائی جہاز میں جگہ نہ مل سکی، بلکہ میری سیٹ یکم اپریل کو کلکتہ سے بک ہوئی۔ اسی درمیان میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک بنگلہ دیشی خاتون نجمہ اطہر آج کل لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا تھا، اس لئے اپنے دہلی سے کلکتہ تک کے سفر کی ایک درمیانی منزل میں نے لکھنؤ کو قرار دیا۔

نجمہ اطہر سے میں کبھی ملا نہیں تھا، ان کی صورت بھی میں نے نہیں دیکھی تھی، لیکن ان سے ملنے کا میں یقیناً بے حد مشتاق تھا۔ ان کی آواز سے میرے کان ضرور آشنا تھے اور خوب آشنا تھے، اور آج بھی جب یہ سطریں میں لکھ رہا ہوں، ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

پچھلے سال یحییٰ خان کی مسلسل وعدہ خلافیوں سے تنگ آنے کے بعد یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو جب

عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمن نے گاندھیائی انداز میں نان کوپریشن کی تحریک شروع کی تو دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی پاکستان کی حکومت مکمل معطل ہوگئی اور پورے مشرقی پاکستان میں عملاً عوامی لیگ کی حکومت قائم ہوگئی۔ نظم و نسق کے اور شعبوں کی طرح ڈھاکہ ریڈیو پر بھی عوامی لیگ کی عمل داری ہوگئی اور وہ "سوادھین (آزاد) بنگلہ بے تار کیندر" بن گیا۔

اس دور میں ہر روز شام کو اسی ڈھاکہ بے تار کیندر سے نجمہ اطہر انگریزی میں خبریں اور تبصرہ نشر کیا کرتی تھیں۔ ان کے پرخلوص لہجے کی دل نشینی اور ان کی پر اعتماد آواز کی دل فریبی آج تک میرے ذہن کے پردوں پر نقش ہے۔

میرے لئے یہ ایک انتہائی افسوس ناک اتفاق تھا کہ جس دن میں لکھنؤ پہنچا، اس سے ایک روز قبل نجمہ اطہر دہلی جا چکی تھیں، لیکن ان کے شوہر جمال اطہر نے کچھ حد تک اس کی تلافی کی۔ پہلے وہ لکھنوی تھے، لیکن اب بنگلہ دیشی ہیں۔ ان کے والد منشی اطہر علی مرحوم اپنے زمانے کے مشہور نیشنلسٹ اور ایک مدت تک سنٹرل اسمبلی کے کانگریسی ممبر بھی رہے تھے۔ جمال اطہر کے بڑے بھائی شرف اطہر تیس پینتیس سال قبل ہندستانی کمیونسٹ تھے، پھر آزادی سے بہت پہلے انگلستان جا کر برطانوی کمیونسٹ بن گئے، اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار (People's War) میں آزادی سے قبل اور (New Age) میں آزادی کے بعد ان کے مضامین اور ان کی بھیجی ہوئی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی اقبال اطہر ہمارے موضوع بنگلہ دیش سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، جو ایک سال قبل تک پاکستان فارن سروس میں تھے۔ یحییٰ خاں کی حکومت نے مارچ ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں ظلم و تعدّی کی قیامت صغریٰ برپا کی تو اس وقت اقبال اطہر یورپ کے کسی ملک میں پاکستانی سفیر تھے۔ وہ اگرچہ غیر بنگالی ہیں — جسے آج کی اصطلاح میں "بہاری مسلمان" کہا جاتا ہے لیکن

انھوں نے یحییٰ خاں کی پالیسی کے خلاف احتجاجاً اپنے عہدے سے استعفا دے دیا اور پاکستان کی شہریت کو ترک کر کے یورپ ہی کے کسی ملک میں سکونت اختیار کر لی۔

جمال اطہر کو ڈھاکہ چھوڑے ہوئے دو ڈھائی مہینے ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے پچھلے واقعات بیان کئے۔ لیکن ڈھاکہ کی تازہ صورت حال بیگم حامدہ حبیب اللہ سے معلوم ہوئی، جو اتر پردیش کی حکومت میں وزیر ہیں اور ہندستانی خواتین کے ایک وفد کے ساتھ بنگلہ دیش گئی تھیں اور وہاں کا دورہ کر کے حال ہی میں واپس آئی تھیں۔ انھوں نے مفید معلومات ہی فراہم نہیں کیں، ان سے چند بنگلہ دیشی خواتین کے نام اور پتے بھی معلوم ہوئے، جو میرے ڈھاکہ کے دوران قیام میں کام آئے۔

۳۰ مارچ کی رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں کان پور سے کلکتے کے لئے روانہ ہوا۔ اس سفر کا پہلا حصہ تو انتہائی صبر آزما نکلا، لیکن دوسرا اسی درجہ دل چسپ بھی ثابت ہوا۔

انڈین ریلویز نے تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی ہیں، ان کی مختصر فہرست میں سب سے زیادہ قابل ذکر وہ تھرڈ کلاس ائر کنڈیشنڈ ٹرین" ہے۔ اسے میں گرمیوں میں "ٹھنڈی گاڑی" اور جاڑوں میں "گرم گاڑی" کہتا ہوں۔ اس میں مسافر گرد و غبار سے بھی یک سر محفوظ رہتا ہے، جس سے کسی اور گاڑی میں مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کی جیب فرسٹ کلاس ائر کنڈیشنڈ میں سفر کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ گاڑی یقیناً بہت بڑی رحمت ہے۔ مگر اس میں رات کے آٹھ گھنٹے کا سفر، کم از کم میرے لئے، تو باعثِ زحمت ہی ہوتا ہے۔ ایک تو میں رات کے بارہ بجے سے پہلے سونے کا عادی نہیں، لیکن اس گاڑی میں ٹھیک دس بجے روشنی گل کر دی جاتی ہے اور

اس کی جگہ بہت ہلکی نیلی روشنی لے لیتی ہے — اتنی ہلکی کہ اسے روشنی کا خیال کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ پھر اس گاڑی میں صرف کرسیاں ہی ہوتی ہیں — ہوائی جہاز کے طرز کی گدّے دار آرام دہ نفیس کرسیاں — جو بٹن دبانے سے کچھ حد تک سیدھی، بلکہ ترچھی ہو جاتی ہیں، لیکن اس پر سونا کارے دارد ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے تک پہلو بدلتے رہنے کے بعد بھی نیند تو نہیں، نیند کے جھونکے ضرور آجاتے ہیں۔

کان پور سے کلکتے کے لیے جب میں اس ٹھنڈی گاڑی میں داخل ہوا تو یہ معلوم کر کے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ تین نہیں بلکہ دو کرسیوں کی لائن میں مجھے کونے کی کرسی ملی ہے۔ تین کرسیوں کی لائن میں کونے کے اور بیچ کے مسافر کو آنے جانے میں خاصی زحمت ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے لیے بھی باعث زحمت بنتا ہے۔

اپنا مختصر سامان گاڑی کی چھت سے ملے ہوئے ریک (Rack) پر جمانے کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ ایک صاحب ہانپتے کانپتے نازل ہوئے۔ لباس، وضع قطع، تن و توش اور سب سے بڑھ کر اپنی بھاری بھرکم توند سے مارواڑی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے آگے آگے کنڈکٹر بھی تھا۔ اس نے میری بغل کی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور انھوں نے اپنے دو بنچے، جو ان کے دونوں ہاتھوں میں تھے، کرسی پر پٹک دیے اور تیزی سے پھر باہر کی طرف لپکے اور جب واپس ہوئے تو ان کے ایک ہاتھ میں میلا سا ایک اٹیچی کیس اور دوسرے میں ایک گٹھری تھی۔

اس ٹھنڈی گاڑی میں سامان رکھنے کا مسئلہ بھی اکثر خاصا ٹیڑھا ہو جاتا ہے خصوصاً ان مسافروں کے لیے جو درمیانی اسٹیشنوں سے سوار ہوتے ہیں۔ مسافروں سے توقع کی جاتی ہے کہ صرف چھوٹا موٹا وقتی ضرورت کا سامان وہ اپنے ساتھ رکھیں گے اور باقی سامان بک کرا کر لگیج وان میں رکھوائیں گے۔ میرے مارواڑی ہم سفر کے ساتھ اگرچہ سامان بہت زیادہ نہ تھا تاہم

درمیانی اسٹیشن سے سوار ہونے کی وجہ سے اس مصیبت کا اسے بھی سامنا کرنا پڑا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالنے کے بعد سامان رکھنے کی جگہ جب کہیں نظر نہ آئی تو سرکار اور پسنجر دونوں کو گالیاں دے دے کر اس نے کہنا شروع کیا:

"گورنمنٹ نے کرایہ اتنا بڑھا دیا ہے پھر بھی اتنے پسنجر سالے نہ جانے کہاں سے آجاتے ہیں کہ اتنی لمبی گاڑی میں فرسٹ کلاس ائر کنڈیشنڈ اور فرسٹ کلاس میں بھی کوئی برتھ خالی نہیں ہے اور کرسی کے لیے بھی دس روپے اُوپر سے دینے پڑے ہیں۔"

"کیا بک رہا ہے بے" ایک صاحب نے جو سامنے ہی کی کرسی پر بیٹھے تھے کہا "پسنجروں کو کیوں گالی دے رہا ہے۔"

"تو بھی تو پسنجر ہی ہے سالے" ایک دوسرے صاحب نے مصرع اٹھایا

"ابے سالے" ایک صاحب جو دلّی والے معلوم ہوتے تھے اوروں کی تائید کی "تجھ سے کس نے کہا تھا کہ اسی گاڑی میں آکر مر"

"ماپ کرو بابا ماپ کرو۔ میں نے کسی کو گالی والی نہیں دی ہے۔ میں تو اپنی قسمت کو رو رہا ہوں" مارواڑی نے صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر کہا۔ "اب آپ ہی لوگ بتاؤ کہاں رکھوں اس سامان کو"

یہ آوازیں سن کر کنڈکٹر بھی آگیا اور اس نے معاملہ رفع دفع کرایا۔ اسی نے ریک پر کچھ سامان کھسکا کر اس کا اٹیچی کیس رکھ دیا۔ گٹھری کرسی کے نیچے پھینکی، بنچے جو اب تک کرسی ہی پر رکھے تھے ان میں سے ایک تو کرسی کے سامنے پیر رکھنے کی جگہ پر رکھ دیا، اور دوسرا میرے پیر کی طرف بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے پیر ہٹایا نہیں اور ناگواری کے انداز میں گھور کر کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ سامان کو کرسی پر چھوڑ کر وہ چلا گیا۔

"اب اسے میں کہاں رکھوں" مارواڑی نے میرے تیور دیکھ کر لجاجت سے کہا "آپ ہی

بتائیے بابو جی!"

"اس طرف کرسی کی بغل میں رکھ دو" میں نے مشورہ دیا۔

"وہ تو راستہ ہے بابو جی" اس نے کہا "اور کسی نے جاتے ہوئے رات کو اٹھا لیا تو میرا تو کباڑا ہو جائے گا۔ لاکھوں کا حساب کتاب ہے اس میں۔ پانچ ہزار دے کر بنوایا ہے۔ اسی کام کے لئے آٹھ دن سے کان پور میں پڑا تھا۔ دو سیکڑہ اوپر سے خرچ ہوا۔"

اس کی بات کا جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو مجبوراً اس نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دوسرا بنچہ کرسی کی بغل میں ڈال دیا۔

"آپ کہاں تک جاؤ گے؟" بنچہ رکھنے کے بعد یہ سوال اس نے اس لہجے میں کیا، جیسے اسے ڈر ہو کہ رات کو کسی درمیانی اسٹیشن پر اتر کر اس کا بنچہ بھی کہیں میں اپنے ساتھ لیتا نہ جاؤں۔

"جہنم تک جاؤں گا" میں نے جل کر کہا "تم بھی وہیں جاؤ گے نا؟"

"نہیں" اس نے بے سمجھے ہوئے کہا "میں تو دھن بادی تک جاؤں گا"

میرے اس مارواڑی ہم سفر کے کپڑے تو اُجلے تھے، مگر اس کے جسم سے ہینگ کی شدید لپٹیں نکل رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس جگہ بیٹھ کر اس نے کھاتہ "بنوایا" تھا، وہ ہینگ کا گودام ہے۔ یہ بدبو اس کے سارے بدن اور دماغ میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ اب خود اسے اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

سونے کے معاملے میں بھی میرا ہم سفر مجھ سے بالکل مختلف نکلا۔ گاڑی چلتے ہی اُسے نیند آگئی اور جوں جوں گاڑی کی رفتار تیز ہوئی اسی مناسبت سے اس کے خراٹے بھی بلند سے بلند تر ہوتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس کے معدے نے بھی حلق کے ساتھ سنگت شروع کر دی، جس نے گردو پیش کے تعفن میں مزید اضافہ کیا۔ دوسری مصیبت یہ آئی کہ نیند کی حالت میں وہ بار بار اس طرح میری طرف

جھکتا کہ اس کا سر میرے شانوں پر اور اس کے آدھے دھڑ کا بوجھ بھی مجھ ہی پر ہوتا۔

کچھ دیر تو اس صورت حال کو میں جھیلتا رہا، پھر اٹھا اور اسے پھاند کر کنڈکٹر کے پاس گیا کمپارٹ منٹ کے باہر وہ چھوٹی سی بنچ پر نیم دراز تھا۔ میں نے بڑی لجاجت کے ساتھ پوری رام کہانی کنڈکٹر کو سنائی۔ وہ اٹھ کر میری کرسی کی طرف آیا، تو اس وقت صورت حال اور زیادہ بگڑ چکی تھی۔ میرے اٹھنے کے بعد میرے ہم سفر نے اپنے دونوں پیر بھی میری کرسی پر رکھ لیے تھے۔ کنڈکٹر خاموشی سے کھڑا رہا۔

"یا تو آپ انھیں یہاں سے اٹھایے یا مجھے کہیں اور جگہ دیجیے!" میں نے عاجزی کے ساتھ تجویز پیش کی۔

"دونوں صورتیں ممکن نہیں ہیں" کنڈکٹر نے سوچنے کے بعد کہا "سامنے کے کمپارٹ منٹ میں ۴۸ نمبر کی کرسی گیا تک خالی جائے گی۔ وہاں کرسی آپ کو چھوڑنی ہوگی۔ لیکن گیا کے بعد دوسرا اسٹاپ دھن باد ہی ہے اور وہیں اس کو اترنا ہے۔ اپنا سامان یہیں چھوڑ دیجیے اور آپ وہاں چلے جایے۔"

یہ تجویز میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلی اور رات کسی طرح کٹ گئی۔ نو بجے صبح کو گاڑی جب گیا پہنچی تو کرسی مجھے چھوڑنی پڑی۔ لیکن اپنی کرسی کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ کچھ دیر کمپارٹ منٹ ہی میں چہل قدمی کرتا رہا، پھر ہاتھ منہ دھو کر رسٹوراں کی طرف گیا۔ وہاں لمبی سی کیو (que) لگی تھی، میں بھی لائن میں کھڑا ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نمبر آیا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ وہاں گزارا جب نکالے جانے کی نوبت قریب آئی تو نکل کر کاری ڈور (Corridor) میں کھڑا یا پھر بیٹھا رہا۔

پونے بارہ بجے گاڑی جب دھن باد کے قریب پہنچی تو میرے پیر کھڑے کھڑے شل ہو چکے تھے گاڑی رکنے سے پہلے ہی اپنی سیٹ کی طرف میں اس طرح لپکا جیسے مجھے ڈر ہو کہ میرے ہم سفر نے

جس طرح میری کرسی پر قبضہ کیا تھا، میرے سامان کو بھی اپنا سامان نہ سمجھ لے۔ گرد وپیش کی فضا اب بھی ہیلینگ کی تیز بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے یہ معقول مشورہ دیا کہ کچھ دیر کے لئے کمپارٹ منٹ میں آنے جانے کے دونوں دروازے کھول کر پنکھے چلا دیے جائیں تاکہ یہ بدبو کسی طرح باہر نکلے۔ اِس مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں کنڈکٹر کی تلاش میں نکلنے ہی والا تھا کہ سامنے سے وہ آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک خاتون بھی تھیں، جو صورت شکل اور لباس سے بنگالن معلوم ہوتی تھیں۔ کنڈکٹر نے میری بغل کی اسی کرسی کی طرف اشارہ کیا جسے ابھی ابھی مارواڑی نے خالی کیا تھا۔ خاتون نے اپنا بیگ کرسی پر رکھ دیا اور قلی نے ان کا سوٹ کیس اوپر لگا دیا۔ قلی کو پیسے دے کر وہ باہر نکل گئیں۔ میں بھی تازی ہوا کی تلاش میں کنڈکٹر سے باتیں کرتا ہوا پلیٹ فارم پر آ گیا۔ کنڈکٹر نے ہماری تجویز مان لی اور آمد و رفت کے دونوں دروازوں کو کھول کر پنکھے چلا دیے۔

گاڑی چلنے سے کچھ قبل میں کمپارٹ منٹ میں واپس آیا تو اپنی جگہ پر بیٹھنے سے پہلے نو وارد خاتون کے بیگ پر نظر پڑی۔ اس پر موٹے موٹے انگریزی حرفوں میں "مسز امینہ خان" لکھا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے خاتون بھی آئیں اور بیگ کو گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہی انھوں نے اپنے نتھنے اس طرح پھلائے جیسے انھیں سخت بدبو محسوس ہوئی ہو اور مشکوک نظروں سے انھوں نے میری طرف دیکھا، جیسے ان کو شبہ ہو کہ یہ بدبو میرے جسم سے نکل کر فضا کو متعفن بنا رہی ہے۔

"معاف کیجیے گا" میں نے ان سے اردو میں کہا "آپ کا گمان صحیح نہیں ہے، یہ بدبو میرے جسم سے نہیں آ رہی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی پورا قصہ میں نے انھیں سنا دیا۔

"تو آپ کا سفر بڑی بے لطفی سے کٹا ہوگا"، یہ کہتے ہوئے خاتون نے اپنے بیگ سے یوڈی کلون (Eaudecologne) کی شیشی نکالی، اپنے کپڑوں پر چھڑکا ہاتھ اور چہرے پر ملا۔ پھر وہ شیشی

میری طرف بڑھادی۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا"، شیشی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے میں نے کہا" آپ نے تو یہاں کی آب و ہوا ہی بدل دی۔"

"میں نے یا یوڈی کلون نے؟" خاتون نے ہنس کر کہا

"یوڈی کلون ہی کا اگر نام لوں"، میں نے جواب دیا " تو آپ کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں زیادتی بھی ہوگی۔"

"میرا نام امینہ خان ہے" خاتون نے خود ہی اپنا تعارف کرایا " اور آپ کا؟"

"آپ کا نام تو مجھے آپ کے ہینڈ بیگ نے بتا دیا تھا" اپنا نام بتانے کے بعد میں نے کہا " صورتاً تو آپ بنگالی معلوم ہوتی ہیں، لیکن نہ جانے کیوں آپ کا نام مجھے غیر بنگالی سا لگتا ہے"

"ہاں میں بنگالی ہوں" امینہ نے ایسے مدھم لہجے میں کہا جس کی تشریح ممکن ہی نہیں ہے۔ اس میں فخر کا احساس بھی تھا اور سوز و گداز کا انداز بھی۔ پھر کچھ رک کر انھوں نے کہا " میں پنجابی بھی ہوں اور برطانوی بھی۔ میں اس بنگال میں پیدا ہوئی آج جسے مغربی بنگال کہتے ہیں۔ میری جنم بھومی کلکتہ ہے، وہیں میرا بچپن گزرا، وہیں میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر میں اس بنگال میں چلی گئی جسے پہلے مشرقی پاکستان کہتے تھے اور اب بنگلہ دیش کہتے ہیں۔ وہاں میں جوان ہوئی، اور وہیں تعلیم حاصل کی، اور ڈاکٹر بنی۔ پھر ڈاکٹری کی اعلا تعلیم کے لیے انگلستان گئی۔ میرے شوہر پنجابی ہیں۔ امرت سر میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر آزادی کے ساتھ ساتھ انھیں وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ پاکستانی بنے، لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی اور وہ بھی ڈاکٹری کی اعلا تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ وہیں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اور ہم میاں بیوی بن گئے۔ پھر ہم دونوں نے برطانوی تومیت لے لی۔ میرے شوہر کو امرت سر سے اتنی ہی محبت

ہے جتنی مجھے کلکتے سے۔ لیکن کلکتے میں تو میرے دو چار عزیز بھی ہیں مگر امرت سر میں تو ان کا کوئی عزیز بھی نہیں ہے۔ ہاں دوست بہت ہیں ــــ ہندو دوست، سکھ دوست۔ وہ اپنے ایک ہندو دوست ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ پچھلے سال جب مشرقی پاکستان میں قیامت آئی تو ہم لوگ ڈھاکہ میں تھے۔ جب بنگالی مارے جانے لگے تو میرے شوہر کا پنجابی ہونا بہت کام آیا۔ ان ہی کی بدولت میرے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ بچ گئے۔ پھر جب بنگالیوں نے بدلہ لینا شروع کیا تو میں اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح نکال کر کلکتے لے آئی۔ یہ قصہ اسی سال جنوری کا ہے۔ کلکتے پہنچتے ہی میرے شوہر کو امرت سر کی یاد ستانے لگی۔ انھوں نے اپنے بچپن کے ایک دوست کو خط لکھا اور اس نے تار دے کر انھیں بلا لیا۔ ہم دونوں برطانوی نیشنل ہیں۔ ہندستان میں بھی رہ سکتے ہیں اور بنگلہ دیش میں بھی ــــ یہ دونوں ملک برطانوی کامن ولتھ کے ممبر ہیں۔ میرے شوہر کو پاکستان سے نہ تو پہلے دل چسپی تھی اور نہ اب ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ میرے شوہر کا امرت سر ہی میں پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی وہیں چلی آؤں اور ہم دونوں مل کر نرسنگ ہوم کھولیں۔ ہمارے پاس کچھ روپیہ انگلستان میں ہے اور کچھ ڈھاکہ میں۔ اس روپے سے ہم کلینک بڑی اچھی طرح کھول سکتے ہیں۔ میرے شوہر نے تو پریکٹس شروع بھی کر دی ہے۔ مریض ان کے پاس آتے ہیں ــــ ہندو مریض، سکھ مریض، کچھ مسلمان بھی آتے ہیں، جو کشمیری ہیں۔ وہ بلا فیس لوگوں کو دیکھتے ہیں اور نسخے لکھ دیتے ہیں۔"

"تو آپ بھی امرت سر جائیں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں جانا ہی پڑے گا مجھے" خاتون نے اداس لہجے میں جواب دیا "میں تو بنگال ہی میں رہنا چاہتی ہوں، خاص کر کلکتہ میں، لیکن میرے شوہر کے سر پر امرت سر کا بھوت سوار

ہے۔ کتنی عجیب بات ہے یہ کہ اسی امرت سر میں ان کا گھر بار لٹ پھک گیا، جائیداد پر ہندوؤں اور سکھوں نے قبضہ کر لیا، لیکن امرت سر کا سودا ان کے سر سے نہیں نکلتا۔ ہندوؤں اور سکھوں سے انھیں آج بھی محبت ہے۔ سکھ اور ہندو بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ کتنی جلد آدمی گزری ہوئی باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وقت کے مرہم میں کتنی قوت ہے، کتنی طاقت ہے، وہ دل کے زخموں کو دماغ کے زخموں کو کتنی جلد مندمل کر دیتا ہے۔" کہتے کہتے وہ چپ ہو گئیں جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گئی ہوں۔

"آپ نے اپنے شوہر کا نام نہیں بتایا!" میں نے ان کے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"میرے شوہر کا پورا نام ہے میر نوازش مصطفےٰ خاں" انھوں نے بتایا "اسے مختصر کر کے خود انھوں نے مصطفےٰ خاں کر دیا ہے۔ اسی نام پر میرا نکاح ہوا تھا اور یہی نام ہمارے پاسپورٹوں پر بھی لکھا ہے۔"

ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اسنسول آگیا۔ ہم دونوں تازی ہوا کے لیے گاڑی سے باہر آئے۔ پانچ سات منٹ کے بعد جب گاڑی چلی تو ہم دونوں ڈائننگ کار میں چلے گئے۔

"مسٹر خان ہندستانی کیوں نہیں ہو جاتے؟" کھانے کی میز پر میں نے سوال کیا۔

"میں بھی ان کی باتیں سن کر اکثر یہی کہتی ہوں" خاتون نے مجھے بتایا "اور وہ کہتے ہیں کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہندستانی نہیں ہوں! میری موجودہ برطانوی شہریت تو کاغذی شہریت ہے اس کی قانونی حیثیت تو ہو سکتی ہے لیکن روحانی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ میں اس ہندستان کا شہری ہوں جسے برصغیر کہتے ہیں جس میں بھارت ہی نہیں، بنگلہ دیش اور پاکستان بھی شامل ہیں، جس کی سرحد میں ایک طرف ہمالہ اور پامیر کی چوٹیاں ہیں اور دوسری طرف بحرِ عرب اور بحرِ ہند ہیں۔ وہ دیوانوں کی طرح یہ خواب بھی دیکھتے ہیں کہ ایک دن یہ تینوں ملک پھر ایک ہو جائیں

گے اور جس دن ان کا یہ خواب پورا ہوا اسی دن وہ اپنی برطانوی کاغذی شہریت کو پرزے پرزے کر ڈالیں گے۔"

کھانے کے بعد جب ہم لوگ اپنی جگہ پر واپس آیے۔ تو خاتون نے اپنے سوٹ کیس سے ایک چھوٹا سا دفتی کا ڈبہ نکالا۔

"یہ بنگالی مٹھائی ہے" انھوں نے ڈبا کھولتے ہوئے کہا "یہ میری کمزوری ہے۔ اس وقت آپ بھی اس سے فایدہ اٹھایئے۔"

ڈبے میں صرف چم چم تھے۔ میں نے شکریہ ادا کرکے دو چم چم لیے۔ تیسرا انھوں نے زبردستی کھلایا۔ میں نے مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے چم چم کی تعریف کی۔

"آپ جہاں جا رہے ہیں" انھوں نے کہا "وہاں یہ بہت اچھے ملتے ہیں۔ اور ہاں یہ تو میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ بنگلہ دیش کیوں جا رہے ہیں؟ آپ کو بنگلہ دیش سے اس قدر لگاؤ کیوں ہے؟ کیا آپ اس کو بھی اپنے ہی ملک کا حصّہ سمجھتے ہیں؟ سچ سچ بتایئے گا۔"

"آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر دیے اور ان میں سے ہر سوال کے جواب میں ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ پھر آپ کی یہ تاکید بھی خاصی دل چسپ ہے کہ میں سچ سچ جواب دوں آپ نے جس خلوص سے اس وقت باتیں کی ہیں، اس کے بعد آپ سے جھوٹ بولنے کا تو کوی سوال ہی نہیں ہے۔

"میں آپ کے آخری سوال سے شروع کرتا ہوں۔ سنئے! سچ یہ ہے کہ میں بھی آپ کے شوہر کی طرح دیوانہ ہوں۔ میرے جذبات بھی وہی ہیں جو ان کے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جب تک پورے برصغیر ـــــ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کا ہر بسنے والا ہم دونوں کی طرح دیوانہ نہ ہو جاے، اس وقت تک ہمارا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ اور اس وقت تک بھارت،

پاکستان اور بنگلہ دیش کی الگ الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں باقی رہیں گی۔ اب رہے آپ کے یہ سوال کہ مجھے بنگلہ دیش سے کیوں اس قدر لگاؤ ہے اور میں وہاں کیوں جا رہا ہوں ــــ تو میں ان دونوں کا یک جائی جواب دوں گا۔

"آپ نے اپنی گفتگو میں بنگلہ دیش کا کئی بار نام لیا، ٹیگور اور نذرالاسلام نے جس کے گیت گائے ہیں۔ ٹیگور کا "سونر بنگلہ" تو بنگلہ دیش کا دوسرا نام بن گیا ہے۔ بنگلہ زبان کے ان دو ہلکے پھلکے لفظوں ــــ "سونر بنگلہ" میں صرف بنگ باسیوں ہی کو نہیں، ہم ہند نواسیوں کو بھی بڑی رومانیت، بڑی جاذبیت، بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ "سونر بنگلہ" کی یہی رومانیت، یہی جاذبیت اور یہی کشش چار مہینوں سے بنگلہ دیش جانے پر مجھے اکسا رہی تھی اور بالآخر لیے جا رہی ہے۔

" دنیا کے اس جدید ترین ملک اور اپنے اس نئے مشرقی ہم سایہ کے ساتھ ہماری گہری دل چسپی اور ہمارے بے اندازہ لگاؤ کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس ملک کے بسنے والوں کے ساتھ ہمارے خونی رشتے رہے ہیں اور رنگ و نسل کے اعتبار سے ہم ایک ہیں۔ ان سب سے قطع نظر، ایک بڑی وجہ اس کی شاید یہ بھی ہے "سونر بنگلہ" کے شاعرانہ تخیل کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں ہمارا بھی حصّہ ہے۔ اپنے دیش کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے، اپنے تصورات کے سانچوں میں ڈھالنے اور اسے آزاد کرانے میں بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ بسنے والوں نے تو تن من دھن کی بازی لگا ہی دی تھی اور آگ اور خوں کے دریا کو پار کر کے وہ اس منزل تک پہنچے لیکن ہمارے ملک کے بسنے والوں نے، ہمارے ملک کی حکومت نے اور سب سے بڑھ کر ہمارے ملک کے جوانوں نے اس منزل تک پہنچنے میں بنگلہ دیشیوں کی مدد ہی نہیں کی، وہ ان کے ہم سفر بھی رہے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک احساس ــــ ایک ذاتی احساس ــــ اور بھی چھپا ہے۔ میں نے جب بھی بنگلہ دیش کی یاترا کا ارادہ کیا، میں نے

فخر کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ ایک پڑوسی ملک کا شہری ہونے کے رشتے سے اور اس سے بھی بڑھ کر ابن آدم ہونے کے ناتے سے بنگلہ دیش کی اولادِ آدم کو آزادی کی منزل تک پہنچانے میں، اپنی بساط کے مطابق، میں نے بھی حصّہ لیا ہے ــــ زبان ہی سے نہیں، قلم ہی سے نہیں، بلکہ عمل سے بھی حصّہ لیا ہے۔

"یوں تو بنگلہ دیش کے اس سفر پر میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو روانہ ہوا، لیکن ذہنی طور پر میرا یہ سفر پہلے، بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ بنگلہ دیش کے جنم لینے سے پہلے بھی مجھے اس کی تاریخ سے دل چسپی رہی ہے۔ سراج الدولہ، شریعت اللہ، دُودُو میاں اور دوسرے ان گنت مجاہدوں کے کارناموں نے میرے لہو کو بھی گرمایا ہے۔ یہ کارنامے بنگلہ دیش ہی کی نہیں ہماری تاریخ کا بھی جزو ہیں۔ ان شان دار تاریخی روایتوں کے وارث بنگلہ دیش ہی کے رہنے والے نہیں ہیں، اس برصغیر ہند کا ہر شہری ان کا وارث ہے۔

"دو صدیوں کے اپنے ذہنی سفر کو اگر میں نظر انداز بھی کر دوں، تو بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ آج سے ایک سال پہلے، ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو میرا یہ ذہنی سفر اس وقت شروع ہوا جب یہ خبر آئی کہ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ پاکستان کے خود ساختہ صدر جنرل یحییٰ خاں جو بات چیت کر رہے تھے، اسے یکایک ختم کر کے وہ واپس راول پنڈی چلے گئے اور ان کی فوجوں نے ڈھاکہ ہی میں نہیں ــــ پورے مشرقی پاکستان میں کشت و خون کا بازار گرم رکھا ہے اور انسانوں کو ــــ اپنے ہم وطن مسلمان بھائیوں کو ــــ کتے بلّی کی طرح مار رہے ہیں۔ اور وہاں کے رہنے والے اپنی جانیں لے کر آسام، بنگال اور تری پورہ کی سرحدوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی پاکستان کی آبادی کا ساتواں حصّہ گھر بار چھوڑ کر لٹے پٹے قافلوں کی شکل میں، ہندستان پہنچ گیا۔ ان پناہ گزینوں میں ہندو ہی نہیں مسلمان بھی تھے۔

وہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے اور عمل کے اعتبار سے اکثر اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر تھے۔

"۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان سے جو خبریں آرہی تھیں، ان سے یہ بات بڑی حد تک صاف نظر آنے لگی تھی کہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک آہستہ آہستہ ابھر رہا ہے۔ اس وقت سے ــــ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء سے ــــ بنگلہ دیش کے جہاد آزادی کی ہر منزل پر اور اس کی جدوجہد کے ہر موڑ پر میرا ذہن بھی، ان گنت ہندستانیوں کی طرح، بنگلہ دیش کے عوام کے ذہن کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر سرگرم سفر رہا ہے۔ میرا یہ ذہنی سفر میرے بہت آڑے آیا۔ اس نے بنگلہ دیش جانے ہی پر مجھے نہیں اکسایا، میری خواہش اور میرے ارادے کو عزم و اعتماد بھی بخشا۔

"بنگلہ دیش کے وجود میں آتے ہی وہاں جانے اور وہاں کے حالات دیکھنے کی آرزو میرے اندر کروٹیں لینے لگی تھی۔ ایک مصنّف اور اخبار نویس کی ناقدانہ نظروں سے میں وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھنا، اپنے کانوں سے سننا اور اپنے قلم سے لکھنا چاہتا تھا۔

۲

میرا بنگلہ دیش جانے کا قصد میرے اکثر دوستوں کے لئے بے حد تشویش ناک ثابت ہوا۔ کچھ نے براہ راست اور کچھ نے بالواسطہ مخالفت کی۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ ایک غیر بنگالی مسلمان کے لئے بنگلہ دیش کے سفر کی سرحدیں سفر آخرت سے مل جاتی ہیں۔ مخالفت کرنے والوں میں ایسے ہندو بنگالی دوست بھی تھے جو حال ہی میں بنگلہ دیش کی یاترا کر کے آئے تھے۔ ان کا بھی کہنا یہی تھا کہ بنگلہ دیش ابھی اس قابل نہیں ہوا ہے کہ وہاں کوئی ایسا غیر بنگالی، خصوصاً غیر بنگالی مسلمان جائے جو بنگلہ نہ بول سکتا ہو۔ وہاں اردو بولنا خالی از خطرہ نہیں ۔ صرف انگریزی سے کام نہیں چل سکتا، کیوں کہ عام لوگ نہ تو انگریزی جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی رائے تھی کہ دو مہینے کے لیئے میں اپنا ارادہ ملتوی کر دوں۔ اس سفر میں پہلا بنگلہ دیشی جو مجھے کلکتے میں ملا اور جو ایک ہی ہفتہ پہلے ڈھاکے سے آیا تھا، اس کا تاثر بھی میرے دوستوں کے تاثر سے مختلف نہ تھا۔ "بس اتنا خیال رکھیے کہ اردو میں کسی سے بات نہ کیجیے۔" اس نے سنجیدگی اور رازداری کے ساتھ مجھے مشورہ دیا تھا۔

یہ بنگلہ دیشی، جس کی طرف اوپر میں نے اشارہ کیا ہے، چھبیس ستائیس سالہ نوجوان تھا۔ اوسط درجے کا قد، اوسط درجے کا بدن، رنگ صاف جو عام طور پر بنگالیوں کا نہیں ہوتا ہے۔ باتیں بہت آہستہ آہستہ کرتا، جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔ اس کے بدن پر وہی گاڑھے کا کرتا اور پاجامہ

تھا، جو عام طور پر دہلی، کلکتہ اور دوسرے ہندستانی شہروں میں پہنا جاتا ہے۔ انڈین ایرلائنز کے دفتر سے، جو چترنجن اوینو پر ہے، دَم دَم تک کی بیس پچیس منٹ کی مسافت ہم دونوں نے ایرلائنز ہی کی بس میں طے کی۔ پہلے وہ مقابل کی سیٹ پر بیٹھا تھا، لیکن جب بس چلی تو نہ جانے کیوں وہ میری بغل میں آبیٹھا۔ لیکن ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ اپنے اس نوجوان ہم سفر کے چہرے پر گھبراہٹ، پریشانی اور نامعلوم خوف کی ہلکی ہلکی تحریریں بھی مجھے نظر آئیں۔ ممکن ہے کہ اپنے ہی چہرے کا عکس میں نے اس کے چہرے میں دیکھا ہو۔

ہماری بس جب کلکتے کی آبادی کو طے کر کے مضافات کلکتہ میں داخل ہوئی تو اک بارگی یاد آیا کہ اب ہم سالٹ لیک (Salt Lake) کے علاقے سے گزریں گے، جو دَم دَم سے ملحق ہے اور جہاں میں پچھلے سال جون میں ان رفیوجیوں کو دیکھنے آیا تھا، جو مشرقی پاکستان سے بھاگ کر پناہ لینے کے لیے ہندستان آئے تھے۔ اس وقت یہاں تا حد نظر آبادی کا سلسلہ نظر آتا تھا۔ یہ تین گھنٹے جو میں نے اس جگہ گزارے، وہ بڑی قیامت کے تھے۔ ہفتوں اس کا میرے دماغ پر اثر رہا تھا۔ بھوکے نیم برہنہ ان گنت انسان ہی نہیں، ان کی بے شمار لاشیں بھی جابجا رکھی تھیں ——— جلانے یا دفن کرنے کے لیے، ان کے جسم پر کفن بھی نہیں تھا، کفن کی جگہ وہی مختصر، بہت مختصر کپڑے تھے، جو مرنے سے پہلے وہ پہنے تھے۔ ان کا کوئی رونے والا بھی نہ تھا۔ لیکن آج سالٹ لیک کا میدان اس طرح صاف تھا کہ جیسے برسوں سے، صدیوں سے، یہاں کی زمین نے آبادی کی شکل ہی نہ دیکھی ہو۔

ہمارے جہاز کی روانگی کا وقت نو بج کر دس منٹ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم دَم دَم پہنچ گئے۔ بس سے اتر کر ایرپورٹ کی عمارت میں ہم داخل ہی ہوئے تھے کہ لاؤڈ اسپیکر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا:

"اٹنشن پلیز (Attention Please)" اعلان کیا گیا۔ "ڈھاکہ جانے والا جہاز مقررہ وقت

کے تین گھنٹے بعد روانہ ہوگا۔ اس جہاز کے مسافروں سے درخواست ہے کہ انڈین ایر لائنز کے کاؤنٹر سے ناشتے کے کوپن لے کر رفرش منٹ روم میں تشریف لے جائیں۔"

یہ قصہ اپریل کی پہلی تاریخ کا ہے۔ اس اعلان کو سننے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ کہیں 'اپریل فول' کے سلسلے کا تو اعلان نہیں ہے۔ لیکن پانچ منٹ کے بعد جب اسی اعلان کو پھر دھرایا گیا اور میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کوپن بدست چلے آرہے ہیں، تو پھر شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ میں بھی بالآخر اٹھا اور کوپن لے کر رفرش منٹ روم کی طرف چلا جو لاؤنج کے آخری سرے کی پہلی منزل پر ہے۔

رفرش منٹ روم خاصا وسیع، صاف ستھرا اور لاؤنج کے برعکس ایرکنڈیشنڈ ہے۔ میں کونے کی ایک میز پر جا بیٹھا۔ میرا نوجوان بنگلہ دیشی ہم سفر میرے بعد ہال میں داخل ہوا اور میرے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ لیکن ویٹر نے اپنی آسانی کی خاطر اسے اٹھا کر میری ہی میز پر بٹھال دیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر اپنی عادت کے خلاف، تعارف کرانے میں میں نے پیش قدمی کی۔

"میں ہندستانی ہوں اور جرنلسٹ ہوں" اپنا نام بتانے کے بعد میں نے انگریزی میں کہا۔

"میرا نام محمود ہے" اس نے نہایت آہستہ سے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

"آپ بھی پہلی ہی بار ڈھاکہ جا رہے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں تو ڈھاکہ ہی کا رہنے والا ہوں" اس نے مسکرا کر جواب دیا "ایک ہفتہ ہوا کلکتہ آیا تھا۔ آپ شاید پہلی بار جا رہے ہیں"

"ہاں! میں پہلی ہی بار جا رہا ہوں" میں نے جواب دیا "وہاں کیا حالات ہیں؟"

"حالات ٹھیک ہی ہیں" اس نے سنجیدگی سے کہا "اور جو خرابیاں اس وقت ہیں، وہ تو جاتے ہی جاتے جائیں گی"

"آپ تو جرنلسٹ ہیں" اس نے مجھے اطمینان دلایا "آپ کے لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بس اتنا خیال رکھیے کہ اردو میں کسی سے بات نہ کیجیے"۔

"صورت، شکل اور لہجے سے آپ مجھے بہاری معلوم ہوتے ہیں" اس بار میں نے اردو میں کہا

"نہیں" اس نے ہنس کر اردو ہی میں جواب دیا "میں بنگلہ دیشی ہوں"۔

مجھے آج بھی گمان ہے کہ محمود بنگالی نہیں بہاری ہے، لیکن اس نے بالاصرار مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اصلاً ڈھاکہ ہی کا رہنے والا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک جاپانی فرم میں ملازم ہے۔ کام تو بڑی حد تک بند ہے، لیکن وہ روزانہ دفتر جاتا ہے۔ اس نے ایک کاغذ پر اپنا پتا بھی لکھ کر دیا۔ مکان نمبر، محلے کا نام اور ٹیلیفون نمبر تو اس نے لکھا لیکن نام نہیں تھا۔ جب میں اس کا نام اردو میں لکھنے لگا، تو اس نے میرا قلم بے اختیار پکڑ لیا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اردو میں نہ لکھیے"۔ پھر اس نے نہ جانے کیوں بنگلہ رسم خط میں اپنا نام لکھ دیا۔

میں اس سلسلے میں مزید سوال کرنے ہی والا تھا کہ ایک اور نوجوان ہماری میز پر آ بیٹھا۔

"میرا نام سوہن سنگھ گوئر ہے" نووارد نوجوان نے انگریزی میں بڑی بے تکلفی سے اپنا تعارف کرایا "اور میں بھی ڈھاکہ جا رہا ہوں"۔

"آپ ڈھاکہ کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں فزیو تھراپسٹ ہوں" اس نے جواب دیا "ریڈ کراس نے ڈھاکہ کے ایک اسپتال کے لیے کنٹریکٹ پر بھرتی کیا ہے"

"کس اسپتال میں آپ کام کریں گے؟" محمود نے پوچھا۔

"اس وقت تو میں ہولی فیملی جاؤں گا" گوئر نے جواب دیا "وہیں سے یہ معلوم ہوگا کہ مجھے کس اسپتال میں کام کرنا ہے"۔

"آپ ہم لوگوں کے ساتھ بس میں تو تھے نہیں؟" محمود نے سوال کیا۔

"میں تو ابھی دِلّی کے جہاز سے اترا ہوں" کونر نے بتایا "میرا جہاز ایک گھنٹہ لیٹ تھا۔ اتفاقاً ڈھاکہ جانے والا جہاز بھی تین گھنٹے لیٹ ہو گیا، ورنہ مجھے آج کلکتے ہی میں رہنا پڑتا۔"

"کیا آپ دہلی ہی کے رہنے والے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں ایسٹ افریقہ کا رہنے والا تھا" کونر نے جواب دیا "اب برٹش نیشنل ہوں میرے والدین لندن میں ہیں۔ اس وقت میں اپنے آبائی وطن جالندھر سے آرہا ہوں۔"

"آپ کے ہاتھ کا کڑا دیکھ کر مجھے گمان ہوتا ہے کہ آپ سکھ ہیں" میں نے کہا۔

"مگر سکھ تو بال نہیں کٹواتے" محمود نے کہا "لیکن ان کے سر کے بال کٹے ہوئے ہیں، داڑھی مونچھ بھی صاف ہے اور یہ سگریٹ بھی پیتے ہیں۔ انھیں آپ نے سکھ کیسے سمجھ لیا!"

"ہاں میں بال کٹواتا ہوں، داڑھی مونچھ صاف کرتا ہوں اور سگریٹ بھی پیتا ہوں" کونر نے کہا "لیکن ہوں میں سکھ ہی، اس لیے کہ سکھ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔"

"تو آپ مونا سکھ ہیں" میں نے کہا

"ہاں میں مونا سکھ ہوں"

"ڈھاکہ کا اب کیا حال ہے؟" کونر نے محمود سے پوچھا

"حالت ٹھیک ہی ہے" اس نے جواب دیا "اور آپ تو ریڈ کراس کا بلّا لگا کر نکلیں گے، اس لیے آپ کے لیے تو کوئی خطرہ ہو ہی نہیں سکتا"

"میں نے سنا ہے وہاں گرانی بہت ہے" کونر نے مزید سوال کیا "میرا سارا انتظام تو ریڈ کراس ہی کو کرنا ہے، لیکن روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں تو باہر سے لینی ہی ہوں گی۔"

"گرانی ہی نہیں ہے، چیزوں کی بھی فی الحال کمی ہے" محمود نے وضاحت کی "خصوصاً

روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی — جیسے صابون، ٹوتھ پیسٹ اور سگریٹ۔ لیکن یہ صورتِ حال عارضی ہے۔"

"اس طرح کا سامان تو نیچے پسنجر لاؤنج کی دو دکانوں پر بہت ہے" کونر نے کہا۔ "تھوڑا بہت سامان تو لے جایا ہی جا سکتا ہے۔"

"اپنے استعمال کے لیے تھوڑا کیا بہت سا سامان بھی آپ لے جا سکتے ہیں" محمود نے بتایا۔ "اول تو کسٹم برائے نام ہی ہوتا ہے، اور کسٹم کے لوگ مسافروں کو بلاوجہ پریشان بھی نہیں کرتے۔"

یہ تجویز مجھے بھی پسند آئی۔ میں بھی کچھ چیزیں خریدنا چاہتا تھا، جو کلکتے میں خرید نہیں سکا تھا۔ رفرش منٹ روم سے اٹھ کر ہم لوگ نیچے لاؤنج میں آئے۔ وہاں دو دو دکانیں آمنے سامنے تھیں۔ کونر نے صرف سگریٹیں خریدیں۔ میں نے چار پیکٹ پائپ کی تمباکو، ایک درجن چاکلیٹ چار پیکٹ بلیڈ کے لیے۔ تمباکو کے علاوہ باقی چیزیں دوستوں اور ان کے بچوں کے لیے خریدی تھیں۔ پھر چائے کی مختلف قسموں کے ڈبے بھی نظر آئے اور ساتھ ہی خیال آیا کہ میرے ایک دوست چائے کے بے حد شوقین ہیں اور ان کے بھائی نے اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ عمدہ قسم کی چائے کا ایک ڈبہ ان کے لیے میں ضرور لیتا جاؤں۔ چناں چہ "کونیزیر" کا ایک ڈبا بھی میں نے لیا۔ میرا خیال تھا کہ پسنجر لاؤنج کی دوکانوں میں چیزیں اگر سستی نہ بھی ہوں تو گراں نہ ہوں گی۔ مگر تجربہ نے ثابت کیا کہ سگریٹ اور تمباکو کے علاوہ ہر چیز کی قیمت بازار سے زیادہ تھی۔ مثلاً چاکلیٹ جو بیس آنے کا بازار میں عام طور پر ملتا ہے، پونے دو روپے کا ملا۔ کونیزیر چائے کی قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے، لیکن اس کی قیمت مجھے ساڑھے پندرہ روپے ادا کرنی پڑی۔

خریداری کے بعد سب سے بڑا مسئلہ سامان کے رکھنے کا تھا۔ تمباکو، چاکلیٹ اور بلیڈ تو میں نے پورٹ فولیو میں رکھ لیے۔ کونر کے پاس ایر بیگ تھا، اس میں چائے کے ڈبے کی جگہ نکل آئی۔

"دیکھیے ڈھاکہ ایرپورٹ پر لینا بھول گئے گا نہیں" کونر نے ہنس کر کہا "ورنہ میں استعمال کرلوں گا اسے۔"

"اگر ایرپورٹ پر بھول گیا" میں نے کہا "تو ڈھاکہ میں کہیں نہ کہیں تمہیں ڈھونڈھ ہی نکالوں گا۔"

"ہاں! ہولی فیملی اسپتال سے میرا پتا چل جائے گا۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ لاوڈ اسپیکر نے ہمیں مخاطب کیا۔

"اٹنشن پلیز (Attention Please) ڈھاکہ جانے والے مسافر انڈین ایرلائنز کے کاونٹر پر جائیں۔" اس وقت سوا گیارہ بجے تھے۔

ایرلائنز کے کاونٹر پر ہمارا ٹکٹ چک کیا گیا اور جہاز میں داخل ہونے کا "اجازت نامہ" — ایک لمبا سا کارڈ دے دیا گیا۔ ایک دوسرے کاونٹر پر پرمٹ دیکھا گیا اور پھر رجسٹر میں اس کی تفصیلات درج کی گئیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ لگے۔ اس کے بعد ہمیں اوپر کے لاؤنج میں جانے کی ہدایت کی گئی۔ یہ غیر ملکوں کو جانے والے اور غیر ملکوں سے آنے والے مسافروں کا لاؤنج ہے۔ یہاں بہت سے صوفے اور گدے دار کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر ایک دبیز قالین بھی تھا۔ سامنے کونے میں ایک بڑی دوکان یہاں بھی تھی لیکن شراب اور سگریٹ کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دوکان میں ہندستانی کرنسی نہیں چلتی تھی۔ صرف ڈالر اور پونڈ دے کر خریداری کی جاسکتی تھی۔

آدھے گھنٹے تک اس لاونج میں مجھے بیٹھنا پڑا۔ پونے بارہ بجے کے قریب لاوڈ اسپیکر نے پھر اعلان کیا کہ ڈھاکہ جانے والا جہاز تیار ہے۔ جب ہم اٹھے تو معلوم ہوا کہ ایک مرحلہ ابھی باقی ہے اور وہ ہے Security Check کا۔ جہاز تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک ڈھلوان پل سے گزرنا تھا۔ پل کے ساتھ ساتھ آٹھ دس چھوٹے چھوٹے سے کیبن بنے ہیں۔ سارے مسافر ایک لائن میں کھڑے ہو گئے، اور ایک ایک کر کے ان کیبنوں میں جانے لگے۔ ہر کیبن میں ایک آدمی کھڑا تھا، جو مسافر کی جیبیں ٹٹول کر اور ہاتھ کا سامان دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ مسافر کے پاس کوئی اسلحہ یا ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جس سے ہوائی جہاز کو وہ ہائی جیک کر سکے۔ چوں کہ کیبن بہت تھے اس لیے دیر نہیں لگی۔ مسافر کیبن سے نکل کر پل سے گزرتے ہوئے نیچے گئے، جہاں جہاز کھڑا تھا۔ اس وقت بارہ بجے تھے، دھوپ بھی شدید تھی، باہر کا پختہ فرش بے طرح تپ رہا تھا۔ ایرپورٹ کی عمارت اور جہاز کا درمیانی فاصلہ تیس پینتیس گز سے زیادہ نہ تھا، لیکن اس فاصلے کو طے کرنا بھی قیامت ہو گیا۔ ہوائی جہاز سے لگا ہوا زینہ طے کر کے جب ہم جہاز کے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک نوجوان خوش شکل، خوش شمایل اور خوش پوش ہندستانی خاتون مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑی تھیں۔ ان کا ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کا انداز بڑا دل ربا یا نہ تھا، جس نے گرمی، دھوپ اور تپش کے احساس کو یک سر ختم کر دیا۔ یہ بوئنگ جہاز تھا، جس میں غالباً ۱۲۸ نشستیں تھیں، لیکن مسافر اس کے آدھے سے کچھ ہی زیادہ رہے ہوں گے۔ سب مسافر جب بیٹھ لئے تو لاوڈ اسپیکر پر پہلے انگریزی میں اور پھر آسان ہندی میں ہم کو اجتماعی طور پر انڈین ایرلائنز کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا اور ساتھ ہی ہمیں یہ اطلاع بھی دی گئی کہ پچیس منٹ میں ہمارا جہاز ڈھاکہ میں اتر جائے گا۔ یہ سن کر کم از کم مجھے تو حیرت ہوئی، کیونکہ میرا گمان تھا کہ مسافت ۴۵ منٹ سے کم نہیں ہے۔

ہمارا جہاز رن وے (Runway) پر دوڑنے کے بعد جب اڑا تو بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ جہاز نے دَم دم سے ڈھاکہ تک کی مسافت پچیس منٹ سے کچھ پہلے ہی طے کرلی۔ لیکن جب ہم جہاز سے اتر کر تیج گاؤں ایر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو سامنے لگی ہوئی گھڑی میں ایک بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ پہلے تو مجھے اس گھڑی کی صحت پر شبہ ہوا، لیکن جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ مجھے یاد آیا کہ اب میں ایک غیر ملک بنگلہ دیش کی سرزمین پر ہوں، جہاں وقت ہمارے ملک کے وقت سے آدھ گھنٹہ آگے رہتا ہے۔ آزادی سے پہلے پورے برصغیر میں ایک ہی وقت تھا، لیکن تقسیم کے بعد ہندستان و پاکستان کی تفریق کو واضح کرنے کے لئے پاکستان نے اور باتوں کے ساتھ دونوں ملکوں کے وقت میں بھی تفریق پیدا کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اور وہ روایت آج بھی قایم ہے۔

۳

پچھلے دسمبر کی چودہ روزہ جنگ کے دنوں میں تیج گاؤں ایر پورٹ کا نام ہندستان ہی نہیں، یورپ اور امریکا کے اخبارات اور ریڈیو نے بھی بے انتہا اچھالا تھا۔ بار بار اس کا ذکر پڑھنے اور سننے کے بعد ایر پورٹ کی عمارت کا جو نقشہ میرے ذہن نے بنایا تھا، اس سے وہ بہت چھوٹی نکلی۔ کسٹم کے سلسلے کی کارروائیاں بھی میری توقع سے کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوئیں۔

کسٹم میں جاتے ہی ایک کاونٹر پر پہلے ایک فارم مجھے بھرنا پڑا، پھر میرا پرمٹ دیکھا گیا اور اور اس پر مہر لگائی گئی۔ دوسرا کاونٹر کرنسی یا نقدی کا تھا۔ یہاں بھی ایک فارم بھرنے کے لیے دیا گیا۔ میرے پاس سونے چاندی کا تو ذکر ہی نہیں تھا، صرف ہندستانی کرنسی تھی۔ چناں چہ فارم پر میں نے "تقریباً ایک ہزار روپے" لکھ دیا۔

"بنگلہ دیش کی کرنسی نہیں ہے؟" متعلقہ افسر نے فارم دیکھنے کے بعد نرمی سے انگریزی میں پوچھا۔

"نہیں، صرف ہندستانی کرنسی ہے۔"

"صحیح تعداد آپ نہیں لکھ سکتے؟"

"نہیں" جیب سے پرس نکالتے ہوئے میں نے کہا "مجھے گننا پڑے گا۔"

"گننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تقریباً کا لفظ کاٹ دیجیے۔" لیکن اس سے پہلے کہ میں تقریباً

کو کاٹوں، خود اسی نے اس پر قلم پھیرنے کے بعد فارم پر دستخط کر دیئے اور مہر لگا دی۔

"اس بات کا خیال رکھیے" فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے ہدایت کی "ہندستانی کرنسی جب بھی آپ کو بدلنی ہو، کسی بینک سے بدلیے اور اس فارم کی پشت پر رقم لکھوا کر مہر لگوا لیجئے۔ واپسی کے وقت یہ فارم آپ کو یہاں دینا ہوگا۔"

اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تیسرے کاونٹر کی طرف بڑھا، جہاں میرا سامان ایک ٹیبل پر رکھا تھا اور ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ آپ ہی کا سامان ہے؟"

"ہاں یہ میرا ہی سامان ہے"

میرے سوٹ کیس کو بلا کھولے ہوئے اس نے چاک سے اس پر نشان بنا دیا۔

"اس میں کیا ہے؟" اب وہ بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔

"کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ کتابیں ہیں۔"

"یہ کیا ہے؟" بیگ سے ایک بنڈل نکال کر اس نے پوچھا۔

"کھانے کی چیزیں ہیں۔"

"کتابیں سیاسی تو نہیں ہیں؟"

"نہیں، سیاسی نہیں ہیں"

"یہ تو اردو میں ہے" ایک کتاب کو دیکھ کر اس نے کہا

"سب ہی کتابیں اردو کی ہیں۔"

"اچھا بند کر لیجیے" بیگ پر بھی چاک پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

اس کارروائی کے بعد پورٹر نے میرا سامان اٹھایا اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کسٹم کی

جھنجھٹ سے اتنی آسانی سے نجات پانے کے بعد بھی میری پریشانی ختم نہ ہوئی۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے جب دم دم ایر پورٹ پر میں بس سے اترا تھا، تو اس وقت تک مجھے یقین تھا کہ ڈھاکہ ایر پورٹ پر کوئی نہ کوئی مجھے لینے ضرور آئے گا۔ کئی دوستوں کو تار سے اپنے پہنچنے کی تاریخ اور وقت سے اطلاع دے دی تھی۔ لیکن دم دم ایر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوتے ہی جب یہ معلوم ہوا کہ جہاز تین گھنٹے لیٹ ہے تو اسی وقت مجھے اندیشہ ہوا تھا کہ ڈھاکہ ایر پورٹ پر آنے والے کہیں مایوس ہو کر واپس نہ چلے جائیں اور پھر شہر تک مجھے تنہا ہی جانا نہ پڑے۔ لیکن اس خیال سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شناسا نہ ملا تو ایر پورٹ سے شہر تک پہلے انڈین ایر لائنز کی بس سے جاؤں گا، اور پھر وہیں سے ٹیکسی لے کر ہندستانی سفارت خانے چلا جاؤں گا، جہاں سب سے پہلے مجھے جانا تھا۔ کیوں کہ دہلی سے روانہ ہونے سے قبل وزارت خارجہ کے ڈائرکٹر پبلسٹی سے میں نے درخواست کی تھی کہ ڈھاکہ میں میرے قیام کا انتظام، کسی اوسط درجے کے ہوٹل میں، ہندستانی سفارت خانے کی معرفت وہ کرا دیں۔ نیز یہ کہ ایک ہندستانی جرنلسٹ کو جو سہولتیں فراہم کی جا سکتی ہوں، وہ مجھے بھی حاصل ہوں۔ اور انھوں نے ازراہ عنایت ڈھاکہ کے ہندستانی سفارت خانے کے پریس کونسلر کو میرے وہاں پہنچنے کی تاریخ سے مطلع کر دیا تھا۔

کسٹم سے نکلنے کے بعد جب میں ایر پورٹ کے بیرونی ہال سے گزر کر پورٹیکو میں پہنچا تو ایک بھی شناسا صورت وہاں نظر نہ آئی۔ ابھی میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ دس بارہ آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ سب ٹیکسی ڈرائیور، اسکوٹر ڈرائیور اور سائیکل رکشا چلانے والے تھے۔

میں نے سختی سے "نو، نو" کہہ کر ان سے جان چھڑائی۔

"بخشش صاحب" پورٹر نے میرا سامان پورٹیکو کے باہر زمین پر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں" میں نے انگریزی میں کہا اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔

میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو ایر لائنز کی بس کہیں نظر نہ آئی۔ پریشانی کے عالم میں اپنا سامان اٹھا کر، جو زیادہ وزنی نہیں تھا، میں ایر لائنز کے دفتر کی طرف گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسافروں کو شہر لے جانے کے لیے ایر لائنز کے پاس بس نہیں ہے۔ مسافر خود اپنا انتظام کرتے ہیں۔ یہ جواب سننے کے بعد مجھے ہندستانی سفارت خانہ یاد آیا۔ اجازت لے کر وہیں سے مَیں نے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ یہ لنچ کا وقفہ ہے، اس لیے کوئی ذمہ دار افسر اس وقت نہیں ہے، اور ان کی واپسی کا پون گھنٹے سے پہلے کوئی امکان بھی نہیں ہے۔

سفارت خانے سے مایوس ہونے کے بعد مجھے محمود اور کوثر کا خیال آیا۔ سامان کو وہیں چھوڑ کر ان دونوں کی تلاش میں نکلا۔ پہلے کسٹم کے حلقے کی طرف گیا، وہاں سے سب نکل چکے تھے، پورٹیکو میں اور پورٹیکو کے باہر دیکھا تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ اب میرے سوا غالباً وہاں کوئی مسافر رہ نہیں گیا تھا۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہرچہ باداباد اب ٹیکسی کر کے سفارت خانے ہی جانا چاہیے۔ ایر لائنز کے دفتر سے سامان اٹھا کر جب میں باہر آیا تو وہاں دو اسکوٹر، ایک ٹیکسی اور چند سائیکل رکشے تھے۔

اس سے پہلے کہ رکشے والوں کا مجھ پر حملہ ہو ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے سامان لیا اور سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی کی چھت پر رکھ کر پھرتی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ لیکن میں نے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا پسند کیا۔

"کدھر جانا ہے؟" انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد ڈرائیور نے اردو میں سوال کیا۔ میرے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں غیر بنگالی اور 'اردو والا' ہوں۔

"انڈین ایمبیسی" میں نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا اور گاڑی چل پڑی۔

یہ ٹیکسی ڈرائیور پہلا بنگلا دیشی تھا جس سے بنگلہ دیش کی سرزمین پر مجھے سابقہ پڑا۔ آدمی خاصا باتونی، مگر دلچسپ ثابت ہوا۔ نکلتا ہوا قد، چھریرہ بدن، گورا رنگ، جسم پر بنگلہ وضع کا کرتا اور پتلی مہری کا پاجامہ تھا۔ بڑی تیزی سے باتیں کرتا اور اسی قدر سست رفتاری سے گاڑی چلاتا، اور یہ دونوں کام ایک خاص ادا کے ساتھ، ایک ہی وقت میں کرتا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتا اور دوسرا اپنی مختصر سی داڑھی پر اس طرح بار بار پھیرتا جیسے بالوں کو کھینچ کر بڑھانا چاہتا ہو۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی باتوں کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا، وہ منزلِ مقصود تک جاری رہا۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ اردو صاف اور بڑی حد تک صحیح بول رہا تھا۔ اس کا سیاسی شعور بھی خاصا بالغ تھا۔

"ڈھاکہ شہر تیج گاؤں ایرپورٹ ہی سے شروع ہو جاتا ہے"۔ ایک تجربہ کار گائیڈ کی طرح اس نے کہنا شروع کیا "اس علاقہ میں بہت سے کارخانے ہیں، مگر آج کل سب ٹھپ پڑے ہیں، نہ مزدوروں کا پتہ ہے نہ مالکوں کا۔ دونوں بہاری تھے"۔

"کہاں چلے گئے وہ لوگ؟"

"بہت تو مارے گئے۔ انھوں نے پاکستان کا ساتھ دیا تھا"۔ پھر کچھ رک کر اس نے کہا "بہت تو اب بھی کیمپوں میں ہیں، جنہیں ریڈ کراس روٹی دیتی ہے۔ کچھ لوگ گھروں میں چھپے ہیں۔ ڈر کے مارے نکلتے نہیں۔ ان سب کو یہاں بہاری کہتے ہیں"۔

"یہاں تو ہر اردو بولنے والے کو بہاری کہتے ہیں، اور تم بھی اردو ہی بول رہے ہو۔ مجھے تو تم بھی بہاری ہی معلوم ہوتے ہو"۔

"اردو تو میں آپ کی وجہ سے بول رہا ہوں"۔ پھر اس نے فخر کے ساتھ کہا "میری زبان تو بنگلہ ہے اور میں بنگلہ دیشی ہوں، بنگلہ دیشی۔"

آمر سونر بنگلہ! آمی تومائے بھالو باشی

"آپ نہ سمجھے ہوں گے اسے۔ یہ ہمارا قومی گیت ہے۔ میرا باپ بھی اسے لہک لہک کر گایا کرتا تھا، لیکن آپ تو ہندستانی ہیں۔ آپ نہ سمجھے ہوں گے"

"ہاں میں ہندستانی ہوں، پکا ہندستانی۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا"

"ہمارے بنگلہ دیش سے بھی؟"

"ہاں مجھے تو لگتا ہے"

"مجھے بھی ہندستان اچھا لگتا ہے، مگر میں نے صرف کلکتہ ہی دیکھا ہے" پھر رک کر اس نے کہا "ہندستان ہم بنگلہ دیشیوں کو اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اس نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ ہندستان نہ ہوتا تو پورا بنگلہ دیش قبرستان بن جاتا قبرستان، ہماری جنگ ابھی ختم نہ ہوئی ہوتی اور آج ہم آزاد نہ ہوتے۔ آپ کی پوسٹنگ ہوی ہے یہاں؟"

"نہیں"

"کسی سے ملنے آئے ہیں؟" میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

"کسی سے ملنے ہی آئے ہیں نا؟" اس نے اپنے سوال کو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس لہجے میں دہرایا، جیسے میری خاموشی نے اس کے گمان کو یقین میں بدل دیا ہو۔ اس کا یہ انداز مجھے کچھ ناگوار ہوا۔ بے اختیار جی چاہا، کہوں کہ تجھ سے کیا مطلب کہ میں کیوں آیا ہوں یہاں، کچھ تیرے باپ کا اجارہ ہے؟ میرا جی چاہا میں آیا۔ لیکن مصلحت کے تقاضے نے میری زبان پکڑ لی۔

"بنگلہ دیش سے ملنے آیا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے" میں نے جھنجھلا کر کہا "میری قریبی عزیز داری ہے ان سے۔ ساری دنیا ان سے واقف ہے، تم بھی جانتے ہو ان کو؟"

"خوب جانتا ہوں، میری ان کی بڑی پرانی ملاقات ہے۔ میں تو ان کی گودوں کا کھیلا ہوا ہوں۔"

پھر اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "مگر ان سے مل کر آپ خوش نہ ہوں گے۔ بنگلہ دیش سے نہیں، صرف تباہی و بربادی سے آپ کی ملاقات ہوگی۔"

"تم تو خاصے سمجھ دار اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو" میں نے حیرت کے ساتھ کہا "میں تو تم کو ٹیکسی ڈرائیور ہی سمجھا تھا، مگر تم تو کچھ اور نکلے۔ اردو تم صرف بول ہی نہیں سکتے بلکہ سمجھتے بھی خوب ہو۔"

"آپ صحیح سمجھے تھے مجھے۔ میں ٹیکسی ڈرائیور ہی ہوں، خالص ٹیکسی ڈرائیور۔ عام طور پر ٹیکسی ڈرائیور ہی جیسی باتیں بھی کرتا ہوں۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں میں بالکل بھول گیا کہ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ میں اس طرح کی باتیں سب سے نہیں کرتا۔ آپ مجھے اور ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ باتیں کرتے سنیں، تو یہ کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے بی اے پاس کیا ہے اور میں گریجویٹ ہوں۔ میں نے اردو بھی پڑھی ہے۔ اسکول ہی میں نہیں، کالج میں بھی اردو پڑھی ہے۔ اردو کی بہت سی کتابیں اب بھی میرے یہاں پڑی ہیں۔ اب نہیں پڑھتا انھیں اور شاید کوئی بھی نہ پڑھے گا۔ آپ کے یہاں بھی تو اب اردو نہیں رہی۔ میں نے سنا ہے کہ آزادی کے بعد وہاں بھی اردو ختم کردی گئی ہے۔ وہاں کی قومی زبان اب ہندی ہوگئی ہے۔"

"میرے ملک کی زبان کے بارے میں تمہاری اطلاع صحیح نہیں ہے۔ ہمارا ملک بڑا ہے، بہت بڑا۔ اس میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں جو بڑی بڑی زبانیں ہیں، وہ سب قومی زبانیں قرار دی گئی ہیں۔ ان ہی میں ایک اردو بھی ہے۔ ہمارے ملک میں جو اخبارات نکلتے ہیں، ان میں انگریزی اور ہندی کے بعد سب سے زیادہ اردو ہی میں نکلتے ہیں۔ جس طرح

آج آپ کو اردو سے نفرت ہو گئی ہے، اسی طرح ہمارے یہاں بھی آزادی کے بعد بہت سے لوگ اردو کے خلاف ہو گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اردو ختم ہو جائے گی۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے اور تیزی سے بدل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل آپ کے یہاں بھی یہی ہوگا۔"

"اگر ہوا بھی ایسا" ڈرائیور نے کہا "تو اس میں بہت وقت لگے گا۔ ہمارے پاس اب سوا زبان کے اور رہا ہی کیا ہے۔ سب دولت عزّت لٹ گئی۔ چوبیس سال تک یہاں لوٹ کھسوٹ ہوئی ہے یہ سب مٹھی بھر لوگوں نے کیا تھا۔ اور میں نے سنا ہے کہ ان ہی مٹھی بھر لوگوں نے پاکستان میں بھی لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی۔ بنگلہ دیش نے آزاد ہو کر اب پاکستان کو بھی آزاد کرا دیا ہے۔ شاید وہاں کے لوگ بھی اب ہماری ہی طرح آزادی کی سانس لے سکیں گے۔ معلوم نہیں پاکستان میں کیا ہوا، لیکن یہاں تو پچھلے سال پورا ملک میدان جنگ بن گیا تھا۔ تیج گاؤں ایرپورٹ جہاں آپ کا جہاز اترا تھا، وہاں دن رات گولے برسے ہیں۔ یہ سڑک جہاں اس وقت یہ گاڑی دوڑ رہی ہے، یہاں بھارتی ٹینک دوڑا کرتے تھے ــــ پاکستانی ٹینک۔ ہندستانی ہوائی جہازوں نے سب کو تباہ کر دیا۔ تب ہی تو پاکستانی جرنیلوں نے ہتھیار ڈالے، ورنہ وہ تو سو برس بلکہ ہزار برس تک لڑتے رہتے۔"

"ہندستانی ہوائی جہازوں نے شہر پر بھی بم گرائے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"شہر پر تو نہیں" اس نے جواب دیا "شہر کے فوجی ٹھکانوں پر ضرور گرائے تھے۔ ایک یتیم خانہ غلطی سے لپیٹ میں آ گیا تھا۔ یونیورسٹی کے علاقے میں بھی دو ایک جگہ بم گرائے گئے تھے۔ وہاں پاکستانی فوج نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ بعض کارخانوں کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا اور گورنمنٹ ہاؤس پر بھی بم گرائے گئے تھے۔ اس کے بعد ہی تو پاکستانی گھبرائے تھے۔ بڑی قیامت کا زمانہ تھا وہ بھی۔" گفتگو کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور

اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

"یہ آواز سن رہے ہیں آپ؟" ڈرائیور نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ آذان ہے اذان!" اس کا یہ جملہ سُن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"آپ ہنسے کیوں؟" ترش لہجے میں اس نے کہا "یہ مسلمانوں کا دیس ہے۔ یہاں پانچ وقت اذان دی جاتی ہے۔ اسی کو سن کر لوگ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ سمجھے آپ!"

"ہنسی مجھے اس لیے آئی کہ میرے ملک میں بھی مسلمان ہیں" میں نے وضاحت کی" اور ان کی آبادی بنگلہ دیس کے مسلمانوں سے کچھ ہی کم ہوگی۔ وہاں بھی ہر جگہ بے شمار مسجدیں ہیں، جہاں پانچ وقت اذان دی جاتی ہے۔ اور سنو! میں بھی مسلمان ہی ہوں"

"یہ شبہ تو مجھے پہلے ہی ہوا تھا کہ آپ مسلمان ہیں" اس نے ہنس کر کہا" پہلے تو ہندستانی مسلمان یہاں بہت آیا کرتے تھے۔ لیکن اب اس کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ بنگلہ دیش آنے والے آپ ہی پہلے ہندستانی مسلمان ہیں، جس سے میری ملاقات ہوئی ہے"

اس جملے کے ساتھ ہی ڈرائیور نے گاڑی ایک چوڑی سی سڑک کی طرف موڑی، جو 'آمد' اور 'رفت' کے لئے دو حصوں میں بٹی تھی۔ دونوں حصّوں کے درمیان میں پھولوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی روش سی بنی تھی۔ سڑک کے دورویہ بڑی اور وسیع دو منزلہ و سہ منزلہ عمارتوں کا تاحد نظر سلسلہ تھا۔

"یہ دھان منڈی روڈ نمبر ٹو (TWO) ہے جناب!" ڈرائیور نے اسی سڑک پر گاڑی موڑتے ہوئے کہا" کہیں آپ کو اپنا جھنڈا دکھائی دے رہا ہے ــــ وہ دیکھیے، داہنی طرف ایک

دو منزلہ عمارت پر ہندستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ یہی انڈین امبیسی ہے"

دھان منڈی روڈ نمبر ۲" سنتے ہی میں چونک پڑا۔ اس لیے نہیں کہ دھان منڈی ہی کے کسی حصے میں شیخ مجیب الرحمان کا ذاتی مکان ہے، جس کی وجہ سے پچھلے ایک سال میں دھان منڈی کے نام نے بھی شیخ مجیب الرحمان سے کم شہرت حاصل نہیں کی ہے۔ میں چونکا اس لیے تھا کہ اسی دھان منڈی روڈ نمبر ۲ ہی کے ایک مکان میں مجھے جانا بھی تھا، جو میرے ایک عزیز اور بچپن کے دوست کی بیٹی کا مکان ہے، جس کی شادی ایک بنگالی خاندان میں ہوی ہے۔

"یہی انڈین امبیسی ہے" یہ کہتے ہوئے ڈرائیور نے ایک دو منزلہ عمارت کے پورٹیکو میں ٹیکسی لگا دی۔ میں گاڑی سے باہر آیا اور ڈرائیور نے میرا سامان اتار کر نیچے رکھ دیا۔ دو آدمی جو سفارت خانے ہی کے چپراسی یا دربان تھے، سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔

"میں دِلّی سے آیا ہوں" میں نے کہا اور انھوں نے میرا سامان اٹھا کر برآمدے میں رکھ دیا۔

"کیا دیا جائے؟" ڈرائیور سے میں نے پوچھا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں" یہ سن کر میٹر دیکھنے کے لیے میں ٹیکسی کی طرف مڑا۔

"ارے، یہ آپ کی ٹیکسی میں؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"وہ تو پاکستانی لے گیے" بعد میں معلوم ہوا کہ بہت کم ٹیکسیوں میں میٹر ہے، اور خود ٹیکسی والوں نے نکال دیا ہے تاکہ من مانا کرایہ وصول کریں۔

"ہاں تو کیا دیا جائے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"دے دیجیے بارہ روپے" ڈرائیور نے اس لہجے میں کہا، جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔

"کہاں سے لی تھی ٹیکسی آپ نے؟" سفارت خانے کے ایک آدمی نے پوچھا

"ایر پورٹ سے"

"زیادہ سے زیادہ پانچ روپے ہوئے۔ آپ چھ دیجیے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے تھوڑی سی حجت کے بعد یہ فیصلہ مان لیا، اور میں نے چھ روپے دے کر اپنی جان چھڑائی۔

ہندستانی سفارت خانے میں داخل ہوتے ہی دہشت، پریشانی اور ذہنی تناؤ سے مجھے نجات مل گئی اور غیر شعوری طور پر میرے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اس جگہ میں بالکل محفوظ ہوں۔ مجھے 'بہاری مسلمان' سمجھ کر کوئی جنگلہ دیشی یہاں مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔

سامان کو وہیں چھوڑ کر میں ریسپشنسٹ (Receptionist) کے کمرے میں چلا گیا، جو برآمدے کی بغل ہی میں تھا۔ ایک بنگالی بابو چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اخبار رکھ دیا، لیکن اس سے پہلے کہ مجھ سے کچھ سوال کریں، میں نے خود ہی صورت حال واضح کر دی۔

"میں دہلی سے آیا ہوں۔ مسٹر ایس بنرجی سے ملنا ہے؟"

"پریس کونسلر سے؟"

"ہاں"

"یہ تو لنچ کا وقت ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا"

"کتنی دیر؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ۔ اتنی دیر آپ آرام کر لیں"

ایک صوفہ نما کرسی پر بیٹھ کر میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا، جو زیادہ بڑا نہیں تھا ایک صوفہ اور اس کے ساتھ کی دو کرسیوں کے علاوہ چار پانچ معمولی کرسیاں دیوار کے ساتھ ساتھ

لگی رکھی تھیں۔ ایک چھوٹی سی میز پر کچھ اخبار بھی بکھرے پڑے تھے۔ کلکتے کے دو انگریزی اخباروں کے علاوہ باقی سب بنگلہ کے تھے، مگر کئی دن پہلے کے۔ دہلی کے شنکرس ویکلی کا بھی ایک پرانا شمارہ رکھا تھا۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ سفارت خانہ ابھی زیر تعمیر ہے اور اس کے صورت پذیر ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔

بیس پچیس منٹ سے زیادہ مجھے انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر بنرجی کے آنے سے پہلے ہی میرا نام ان کی میز پر موجود تھا، اور انھوں نے آتے ہی بلا لیا۔ میری توقع سے زیادہ گرم جوشی اور بے تکلفی سے ملے۔ رسمی گفتگو کے بعد قیام کی صورت حال بیان کی۔

"یہاں صرف دو قابل اطمینان ہوٹل ہیں" انھوں نے بتلایا ایک تو انٹر کانٹی ننٹل (Inter-Continental) اور دوسرا پوربنی۔ لیکن دونوں خاصے گراں ہیں۔ کانٹی ننٹل میں چھوٹے سے چھوٹا کمرہ سوا سو روپے روز کا ہے، اور فی الحال کوئی چھوٹا کمرہ خالی نہیں ہے۔ پوربنی میں ساٹھ روپے روز کا چھوٹا کمرہ مل سکتا ہے۔ کھانے کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ ایک ہوٹل اور بھی ہے وہاں البتہ بیس روپے کا کمرہ مل جائے گا، مگر وہ زیادہ قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ سب سے اچھی جگہ سرکٹ ہاؤس ہو سکتی ہے۔ دو دن سے کوشش کی جا رہی ہے، لیکن متعلقہ افسر ملتے ہی نہیں۔"

"ایک بنگلہ دیشی خاندان سے میں واقف ہوں" مسٹر بنرجی سے میں نے کہا "جو اسی دھان منڈی روڈ نمبر ۲ پر رہتا ہے۔ آج ہی مجھے ان لوگوں سے ملنا بھی ہے۔ میرے یہاں پہنچنے کی تاریخ اور دن کی بھی انھیں اطلاع ہے۔ ممکن ہے کہ وہ میرے منتظر بھی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔" ان ہی لوگوں کی معرفت آپ قیام کا انتظام کریں تو زیادہ مناسب اور قابل اطمینان ہوگا۔ لیکن اگر کوئی صورت نہ نکلے تو آپ پوربنی چلے جائیے وہاں آپ کے لیے ایک

کمرہ ہے"

قیام کا مرحلہ طے ہونے یا نہ ہونے میں پانچ بج گئے۔ مسٹر بنرجی نے ازراہ عنایت سفارت خانے کی ایک گاڑی کا بھی انتظام کیا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ پہلے وہ مجھے دھان منڈی کے تسلقہ مکان میں لے جائے اور پھر جہاں میرے رہنے کا انتظام ہو وہاں پہنچا دے۔

"اردو میں کسی سے بات نہ کیجیے" رخصت کرتے ہوئے مسٹر بنرجی نے ہدایت کی" اور جہاں تک ہو سکے چھ بجے کے بعد نہ نکلیے کل تو اتوار ہے، پرسوں گیارہ بجے تک آجائیے تو لوگوں سے آپ کی ملاقات کا پروگرام میں طے کرا دوں گا۔"

"کہاں جانا ہے؟" گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد ڈرائیور نے سوال کیا

"مکان نمبر ۲۸ میں"

"بنگلہ جانتے ہیں آپ؟"

"یہ سوال تم نے کیوں کیا؟"

"یہاں اب مکانوں کے نمبر بھی بنگلہ ہی میں ہیں، اور میں پڑھ نہیں سکتا"

"میں بھی تمہاری ہی طرح جاہل ہوں"

"چلیے کسی سے پوچھنا پڑے گا"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"رام سنگھ"

رام سنگھ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ مکانوں کے نمبر دیکھتا جاتا تھا۔ ہر مکان پر نمبر بنگلہ ہی میں تھے، جو نہ وہ سمجھ سکتا تھا اور نہ میں۔

"سڑک کے اس سرے پر ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہوتا ہے، اس سے شاید پتا چلے" سڑک کا پورا چکر لگانے کے بعد رام سنگھ نے کہا اور گاڑی موڑ دی۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ ٹریفک کے سپاہی نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کونے کے مکان کی طرف اشارہ کر کے بنگلہ میں کچھ کہا۔ رام سنگھ نے بعد میں بتلایا کہ سپاہی کہہ رہا تھا کہ "اتنا بڑا بورڈ سامنے لگا ہے اور تم کو نظر نہیں آتا"

رام سنگھ نے گاڑی گھما کر ایک دو منزلہ مکان کے سامنے کھڑی کر دی، جس کا بڑا سا آہنی پھاٹک اندر سے بند تھا۔ گھنٹی کا بٹن مجھے کہیں نظر نہ آیا تو پھاٹک کو میں نے زور سے تھپتھپایا۔ پھاٹک کے کنواڑ اور ملحقہ دیوار کے درمیاں تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ ایک بوڑھے بنگالی نے اسی درار سے جھانک کر بنگلہ میں کچھ پوچھا، جو میں سمجھ نہ سکا۔

"عارف صاحب آچھے؟" میں نے سوال کیا

"آچھے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرا نام اور شاید پتا بھی بنگلہ میں پوچھا۔

بڈھے بنگالی نے بڑی مشکلوں سے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھولا اور میں مکان کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ میرا نام پوچھ کر وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان صاحب باہر تشریف لائے۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"عارف صاحب سے"

"میرا ہی نام عارف ہے، فرمائیے کیا کام ہے؟"

"میں دلّی سے آیا ہوں" نام بتاتے ہوئے میں نے کہا

"ارے! معاف کیجیے گا۔ دربان کی سمجھ میں آپ کا نام آیا نہیں، اس نے مجھ سے کوئی دوسرا نام لیا تھا" معذرت کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا "آپ کب یہاں پہنچے اور آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"سامان باہر گاڑی میں ہے"۔

انھوں نے دربان سے کچھ بنگلہ میں کہا اور اس نے پھاٹک کھول دیا۔ گاڑی اندر آگئی۔ میرا مختصر سامان گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھا تھا۔ کسی آدمی کو آواز دے کر انھوں نے سامان اتارنے کا اشارہ کیا۔

"تو گاڑی واپس کر دوں!" میں نے پوچھا۔

"ہاں واپس کر دیجیے" "میں اپنی گاڑی سے لے چلوں گا، ابّو کے یہاں"

عارف ہی سے نہیں، ان کی بیوی سے بھی میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، لیکن دونوں اس طرح ملے جیسے پرانے جاننے والے ہوں۔ میں نے آج کا سارا ماجرا ان کو سنایا۔

"ہوٹل میں ٹھہرنے کا کوئی سوال نہیں ہے" ان دونوں نے کہا "آپ ابّو ہی کے ساتھ ٹھہریے۔ وہاں سب لوگ آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ مایوس ہو چکے ہوں"۔

"میرے یہاں آنے کے دو مقصد ہیں" میں نے کہا "ایک تو عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کرنا اور ان کا حال دریافت کرنا۔ دوسرے مجھے بنگلہ دیش سے بھی ملنا اور اس کا بھی حال دریافت کرنا ہے۔ کسی 'بہاری' کے ساتھ ٹھہر کر۔ خواہ وہ یوپی ہی کا کیوں نہ ہو بنگلہ دیش کھل کر مجھ سے نہ ملے گا۔ بنگلہ دیش کے جن لوگوں سے مجھے ملنا ہے، وہ مجھ کو بھی، اگر 'بہاری' نہیں تو کم از کم مشتبہ ضرور سمجھیں گے"۔

"نہیں، ایسا ہونا اول تو ضروری نہیں ہے، اور پھر آپ تو میرے مہمان ہیں۔ میں تو کھاٹی بنگالی ہوں"

"آپ کے جن لیڈروں سے مجھے ملنا ہے" میں نے جواب دیا" ان سے ملاقاتوں کا پروگرام آج سے کل تک طے ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی آپ کے یہاں آنے کا پروگرام بن سکے گا۔"

"تو کل میں آپ کے ٹیلیفون کا انتظار کروں گا" سید حسین نے اپنا کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا" کل گیارہ سے ایک تک دفتر میں رہوں گا، اور اس کے بعد چار بجے تک گھر پر ملوں گا"

ایک اَن جانے ہندستانی میں، جس کی زبان اردو ہو اور جو اردو ہی میں لکھتا ہو، بنگلہ دیشی نوجوانوں کی غیر معمولی دلچسپی میرے لئے حیرت ناک حد تک غیر متوقع، مگر خوش گوار تجربہ ثابت ہوئی۔ اس ملاقات نے بہت سے وہ اندیشہ ہائے دور و دراز دور کئے، جو بنگلہ دیش اور بنگلہ دیشیوں کے سلسلے میں میرے ذہن میں پیدا ہو گئے تھے۔ ڈھاکے کے دوسرے اور تیسرے دن اسی طرح کے دو اور خوش گوار تجربات ہوئے۔

۴ راپریل کو مجھے جناب اسدالزماں صاحب[1]، ڈائرکٹر اکسٹرنل پبلسٹی سے بھی ملنا تھا۔ ان سے ملاقات کا وقت ہمارے پریس کونسلر مسٹر بنرجی نے مقرر کیا تھا اور میرے متعلق انھوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں اردو کا مصنف اور اخبار نویس ہوں۔ ان سے گفتگو میں نے انگریزی میں شروع کی، لیکن جواب اردو میں ملا۔

"تشریف رکھیے"

"شکریہ" میں نے بیٹھتے ہوئے پھر انگریزی میں کہا۔

"کب تشریف لائے آپ؟" انھوں نے پھر اردو ہی میں سوال کیا

---

[1] بنگلہ دیش میں مسٹر کی جگہ پر نام سے پہلے جناب اور بعد میں صاحب کا اضافہ ضرور کیا جاتا ہے۔

میرا جی چاہا کہوں کہ مجھے تو ہر شخص نے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں اردو میں کسی سے بات نہ کروں، لیکن آپ تو اردو ہی میں مجھ سے گفتگو کرنے لگے اور اتنی صاف اور شستہ اردو میں! اب میں نے بھی اردو ہی میں باتیں شروع کر دیں۔

"آپ کا کیا پروگرام ہے یہاں؟" انھوں نے پوچھا

"یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے" میں نے جواب دیا "آج تک میں اور میرا پروگرام مسٹر بنرجی کے ہاتھ میں تھا، اب میں اپنے کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ جو پروگرام بنائیں گے، اس پر میں عمل کروں گا۔"

"بہت شکریہ آپ کا" انھوں نے کہا "اب تک کس کس سے آپ کی ملاقات کا وقت طے ہوا ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر کے بعد مجھے آپ کے فارن منسٹر سے ملنا ہے، پھر آج ہی ساڑھے سات بجے آپ کے وزیراعظم شیخ مجیب الرحمان سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ پرسوں گیارہ بجے صبح کو مجھے ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملنا ہے۔ اب آگے کا پروگرام آپ بنائیے۔"

۵ اپریل کو ساڑھے گیارہ بجے تاج الدین صاحب سے میری ملاقات کا وقت ڈائرکٹر اکسٹرنل پبلسٹی کے دفتر نے مقرر کیا۔ ان سے ملنے کے لئے مجھے سکریٹریٹ جانا تھا۔ سوا دس بجے کے قریب میں نے سواری کی تلاش شروع کی۔ ایک بنگلہ دیشی نوجوان بھی سواری کی جستجو میں میری ہی طرح حیران و سرگرداں تھا۔ اس کی اور میری منزل مقصود بھی ایک ہی تھی۔

"یہ آٹھ آنے سواری مانگ رہا ہے" ایک رکشا طے کرنے کے بعد نوجوان نے انگریزی میں مجھ سے کہا "آپ بھی آنا چاہیں تو آجائیے"

شکریہ ادا کرکے میں بھی اس کی بغل میں بیٹھ گیا۔ میرے نوجوان ہم سفر کو اس کا اندازہ شاید پہلے ہی ہو گیا تھا کہ میں ہندستانی ہوں۔ اس نے کچھ سوالات پہلے انگریزی میں کیے، پھر خود ہی اردو میں باتیں شروع کر دیں۔

"روزمرہ کی اور ضروریات کی طرح سواری بھی آج کل یہاں مشکل ہی سے ملتی ہے" نوجوان نے کہا "ٹیکسی تو دوا کے لیے بھی ڈھونڈھیے تو نہ ملے گی۔ آٹو رکشا بھی کم ہو گیے ہیں۔ رکشے ملتے ہیں، لیکن قریب کی جگہوں پر جانا نہیں چاہتے اور جاتے بھی ہیں تو دونا بلکہ تین گنا کرایہ مانگتے ہیں۔"

"اس کی وجہ کیا ہے؟"

"موٹر اور آٹو رکشا کے پرزے نہیں ملتے اس لیے بیشتر ٹیکسیاں اور اکثر آٹو رکشے بے کار کھڑے ہیں۔ سائیکل رکشا کے ٹائر نہیں ملتے اور ملتے بھی ہیں تو چوگنے داموں پر۔"

"کیا واقعی ان چیزوں کی کمی ہے؟"

"نہیں، اتنی زیادہ کمی کسی چیز کی بھی نہیں، حقیقتاً آج یہاں جو قلت ہے، وہ بڑی حد تک مصنوعی ہے۔ منافع خوری کے لیے لوگوں نے ضروریات زندگی کی تمام چیزوں کو دبا دیا ہے۔"

منزل مقصود پر جب ہم پہنچے تو نوجوان بنگلہ دیشی نے میرے اصرار کے باوجود مجھے کرایہ ادا نہیں کرنے دیا۔ سکریٹریٹ کے گیٹ پر میرا پاس بنوایا۔

"تاج الدین صاحب سے آپ کو کس وقت ملنا ہے؟"

"ساڑھے گیارہ بجے"

ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے، آیے ایک پیالی چائے پی لی جائے"

میں مقررہ وقت سے ادھ گھنٹہ پہلے تاج الدین صاحب کے دفتر میں پہنچنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے یہ تجویز بخوشی قبول کر لی۔

"دیکھا ڈھاکہ آپ نے؟ کیسا لگا آپ کو؟" نوجوان بنگلہ دیشی نے سوال کیا۔

دنیا کے اکثر ملکوں میں عموماً اور ایشیا و افریقہ کے نو آزاد ملکوں میں خصوصاً ہر نو وارد کو اس نوع کے سوالوں سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی یہ سوال ضرور پوچھا جاتا ہے، لیکن وہاں اس کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ سوال کرنے والا جواب میں اپنے ملک کے قدرتی مناظر کی دل فریبی کا قصیدہ سننے کا متمنی نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا 'سونار بنگلہ' جنگ کی آگ میں تپ کر کندن بنا یا نہیں! جب اپنی توقع کے مطابق اسے جواب مل جاتا ہے تو وہ دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کرتا ہے:

"ابھی تو آپ کو ہر طرف ویرانی — وحشت ناک ویرانی نظر آئے گی۔ قتل و غارت گری کے بھیانک نشانات آپ کو دکھائی دیں گے۔ پہلے یہ دیس ایسا نہ تھا۔" یہ سب وہ اس لہجے میں کہتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو:

قیاس کن زخزانِ من بہارِ مرا!

اس کے ساتھ ہی وہ پچھلے پچیس سالہ پاکستانی استحصال — سیاسی، اقتصادی و سماجی استحصال — کی دردناک داستان سنانا شروع کر دیتا ہے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے اس کے لہجے کے سوز و گداز میں غم و غصّے کی آمیزش بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی آواز بھی تیز تر ہونے لگتی ہے اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں اور منہ سے جھاگ بہنے لگتی ہے۔ لیکن جب وہ مکتی باہنی اور دوسرے گوریلا جنگ بازوں کے کارناموں اور ان کی شاندار کامیابیوں کا بیان شروع کرتا ہے تو اس کا چہرہ بھی سونار بنگلہ کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ میرا یہ نوجوان دوست بھی دوسرے بنگلہ دیشیوں سے مختلف نہ تھا۔

"کوئی بھی ملک جب آزاد ہوتا ہے" میں نے کہا "تو طرح طرح کے ان گنت مسایل کا اسے

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بنگلہ دیش کے سامنے آج کون کون سے مسایل ہیں؟"

"آپ نے صحیح کہا کہ آزادی ہمیشہ اپنے ساتھ مسایل کا انبار بھی لاتی ہے۔ اور پھر ہمارا ملک تو عام حالات میں آزاد بھی نہیں ہوا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک سال تک اسے جنگ ـــ باضابطہ جنگ ـــ کرنی پڑی۔ اس غیر معمولی صورت حال نے ہمارے مسایل کی فہرست کو بہت طویل بنا دیا ہے۔ لیکن بنیادی مسئلہ ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ وہ ہے غریبی کا مسئلہ۔ یہ نیا نہیں، پرانا، صدیوں پرانا ہے۔ ہمارے دیس کے بسنے والے نہ جانے کب سے غریبی و مفلسی کا شکار رہے ہیں۔ ہمیں علوم ہے، اور ہمارے عوام بھی جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایک دن میں حل نہیں ہو سکتا، مگر وہ زیادہ دنوں تک انتظار بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اس کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہے۔ اسی غریبی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے سوشلزم کو اس نے اپنا نصب العین بنایا ہے۔ اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ اقدامات بھی کیے ہیں۔"

"کیا آپ کی موجودہ حکومت سنجیدگی سے سوشلزم لانا چاہتی ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ موجودہ حکومت سنجیدگی سے سوشلزم لانا چاہتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں اسے زیادہ دشواری بھی نہ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں بورژوازی طبقہ نہ تو پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ پاکستانی دور میں یہاں صرف مغربی پاکستان ہی کی بورژوازی چھائی ہوئی تھی۔ پاکستان کا شاید یہ بہت بڑا احسان تھا کہ مقامی لوگوں کو اس نے صنعتی میدان میں آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ایک بالائی متوسط طبقہ تو اس نے ضرور پیدا کیا جو آج اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر سکتا تھا جو پاکستانی بورژوازی کے نکل جانے سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ہماری حکومت نے بڑی بڑی صنعتوں اور تجارت کے بعض شعبوں کو قومیانے کی پالیسی کو اپنا کر اس کی راہیں روک

دی ہیں۔ آپ کے ملک کا بھی وہی نصب العین ہے جو ہمارا ہے، لیکن آپ کے یہاں ایک بورژوازی طبقہ پہلے ہی سے موجود تھا، جو آزادی کے بعد مضبوط تر ہو گیا۔ اسے ختم کرنا آسان نہ ہوگا، لیکن ہمارے یہاں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

میرے نوجوان بنگلہ دیشی دوست کی باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ میری نظر گھڑی پر پڑی۔

"گیارہ بج کے بیس منٹ ہو چکے ہیں" میں نے کہا "اب مجھے جانا چاہیے۔"

"چلیے میں آپ کو تاج الدین صاحب کے کمرے تک پہنچا دوں"

"یہ اتفاقیہ ملاقات میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی ہے" شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ابھی میں اور باتیں کرتا۔"

یہ بھی عجیب اتفاق تھا، جس پر آج مجھے حیرت بھی ہو رہی ہے کہ اس گھنٹے بھر کی ملاقات میں نہ اس نے میرا نام پوچھا اور نہ میں نے اس کا۔

بنگلہ دیش اور بنگلہ دیشیوں کے بارے میں جو خیالات میں دہلی سے لے کر چلا تھا اور جو میرے سفر کے دوران پختہ تر ہو گئے تھے، ہمایوں کبیر اور سید حسین نعمانی کی ملاقات نے انھیں متزلزل کر دیا تھا، لیکن اس بنگلہ دیشی نوجوان کے پر خلوص طرز التفات نے تو یک سر انھیں منہدم ہی کر دیا۔ اب میں بلا کسی رہنما کے ڈھاکے کی سڑکوں پر گھومنے پھرنے ہی نہیں لگا، بلکہ ہوٹلوں اور دوکانوں پر سوال و جواب بھی اردو ہی میں کرتا۔ کبھی کبھی اَغل بغل میں کھڑے ہوئے لوگ گھوم کر میری طرف دیکھ تو ضرور لیتے، لیکن ان کی نظروں میں حقارت یا نفرت کا شائبہ نہ ہوتا۔

ان دونوں تجربات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آج کا بنگلہ دیش بڑی تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھ سے چھ مہینہ بیس روز قبل جو لوگ بنگلہ دیش آیے تھے اور انھوں نے جو انتقامی روح یہاں دیکھی تھی، اب اس کی جگہ تعمیر نو کی تڑپ نے لے لی ہے۔

ان تجربات کا ذکر میں نے ایک 'بہاری' دوست سے کیا، جو اپنے خاندان کو لیے ہوے پچھلے تین مہینوں سے خود آید کردہ نظر بندی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

"مار پیٹ اور انفرادی قتل و غارت کا دور یقیناً اب ختم ہو چکا ہے"۔ انھوں نے بھی اعتراف کیا "لیکن اجتماعی طور پر نفرت ابھی دلوں میں چھپی ہے، اور کسی وقت بھی کوی واقعہ پیش آسکتا ہے۔ پھر تمہیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جس کسی سے تم ملے، اس نے یہ محسوس کر لیا یا تم نے خود اسے بتا دیا کہ تم ہندستانی ہو اور یہاں حالات کا مشاہدہ کرنے آیے ہو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہندستان کے ساتھ ممنونیت کا جذبہ بھی بنگلہ دیشیوں کے دلوں میں ابھی موجود ہے"

یہ تجزیہ بڑی حد تک حقیقت پسندانہ ہے۔ قتل و غارت، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کا دور یقیناً ختم ہو چکا ہے۔ اس کے جو اسباب میرے 'بہاری' دوست نے گنائے تھے، ان کے علاوہ اس کی ایک وجہ —— اور شاید سب سے بڑی وجہ —— یہ بھی ہے کہ روزمرہ کی زندگی کے بھیانک مسایل آج بڑی تیزی سے بنگلہ دیش میں سر اٹھا رہے ہیں، جنھوں نے بنگلہ دیشیوں کی توجہ کا مرکز بدل دیا ہے۔

۵

بنگلہ دیش کے لیڈروں اور وزیروں میں میری ملاقات سب سے پہلے وزیرِ خارجہ عبدالصمد آزاد سے ہوئی، جو سیاست کے پرانے مردِ میدان ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں، جو غیر منقسم ہندستان کے آخری عام انتخابات تھے، انھوں نے ایک ممتاز کانگریسی امیدوار کو شکست دی تھی اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آسام اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کی عوامی سیاسی زندگی میں ملک کی ترقی پسند اور بائیں بازو کی پارٹیوں سے ان کا تعلق رہا۔ پاکستان کے پہلے عام انتخابات میں، جو اس کے قیام کے تیئیس سال بعد دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہوئے تھے اور جس میں عوامی لیگ نے غیر معمولی اکثریت حاصل کی تھی، وہ بھی نیشنل اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

پاکستانی فوجی ڈکٹیٹرشپ کی غلط روی اور غلط اندیشی نے مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی داخلی خودمختاری کے مطالبے کو مکمل آزادی کی جدوجہد میں بدل کر پورے ملک کو میدانِ جنگ بنا دیا اور تاج الدین نے آزاد بنگلہ دیش کی پہلی حکومت بنائی تو انھوں نے عبدالصمد کو اپنا سیاسی مشیر نامزد کیا۔ اس وقت ان کی وہی حیثیت تھی جو آج ہمارے یہاں وزارت خارجہ کے پالیسی ساز کمیشن کے چیئرمین درگا پرشاد دھر کی ہے۔ عہدے کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے کام کا میدان دہلی بنا، جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے سفارت خانے تھے، جن

سے رابطہ قایم کرنا اور انھیں بنگلہ دیش کا نقطۂ نگاہ سمجھانا ہی ان کا فرض منصبی تھا۔ چناں چہ بڑی حد تک دہلی ہی ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، جہاں وہ فرضی ناموں سے مختلف ہوٹلوں میں قیام کرتے۔ اسی دور میں بنگلہ دیش کے با اختیار سفیر کی حیثیت سے بھی انھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کی راج دھانیوں کے دورے بھی کیے۔ عالمی امن کونسل کا جو اجلاس مئی ۱۹۷۱ء میں بوڈاپسٹ میں ہوا تھا اور جس میں بنگلہ دیش کی صورتِ حال خصوصیت سے زیر بحث آئی تھی، اس میں بھی انھوں نے بنگلہ دیش کی نمائندگی کی تھی۔

جون ۱۹۷۱ء کے اوایل میں بنگلہ دیش کی حکومت کو آل انڈیا پختون جرگہ ہند سے رابطہ قایم کرنے کی ضرورت پیش آئی، جس کا صدر دفتر دہلی میں ہے۔ جرگہ کے صدر میرے دوست کھیڑا خاں (گوپال داس کھیڑا) اور جنرل سکریٹری خان لالہ جان خاں ہیں۔ اس ادارے کی نوعیت انڈو پختون فرینڈشپ اسوسی ایشن کی ہے غیر پختون بھی اس کے ممبر اور عہدے دار ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ راقم اور جمنا داس اختر، غیر پختون ہونے کے باوجود، جرگہ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ اسی تعلق کی بنا پر صمد صاحب سے پہلی بار میں کلکتہ میں ملا۔ پھر جب دہلی میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ بڑھا تو وہ ہم لوگوں سے بہت قریب آگیے۔

ڈھاکہ پہنچنے کے دوسرے دن میں نے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باہر گیے ہیں۔ تیسرے دن میں میری ان کی بات چیت ہوی۔

"کب آئے؟" حیرت کے ساتھ انھوں نے سوال کیا۔

"پرسوں پہنچا۔"

"اکیلے ہی آیے ہیں یا اور دوست بھی ساتھ ہیں؟"

"میں ابھی آیا ہوں"

"میرا خط کھیڑا کو ملا تھا، جو پچھلے ہفتے میں نے لکھا تھا؟"

"ہاں ملا، مگر میرے دہلی سے روانہ ہونے کے بعد۔ اس کی نقل کھیڑا نے مجھے کلکتے کے پتے پر بھیجی تھی۔ لیکن میں کلکتہ تک پہنچ چکا تھا اور ہوائی جہاز کی سیٹ بھی بک ہو چکی تھی، اس لئے میں نے اپنا پروگرام ملتوی نہیں کیا۔ اب یہ بتلائیے کہ ملاقات کب ہوگی؟"

"ابھی بتلاتا ہوں" پھر دو منٹ کے بعد، غالباً ڈائری دیکھ کر انھوں نے کہا "کل ساڑھے پانچ بجے شام کو یہیں دفتر آجائیے"

بنگلہ دیش کی وزارت خارجہ کا دفتر سکریٹریٹ کے قریب ہی ایک قدیم وضع کی سہ منزلہ عمارت میں ہے، جو شاید برطانوی عہد کی یادگار ہے۔ پہلے اس جگہ ڈھاکہ ڈویزن کے کمشنر کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے آج بھی اس کا پتا 'اولڈ کمشنرس آفس' بتایا جاتا ہے۔ عمارت کے گرد نیچی سی چار دیواری ہے اور پورٹیکو کے سامنے چھوٹا سا لان اور بائیں باغ بھی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہاں سکیورٹی کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ داخلے کے بیرونی پھاٹک پر ایک سپاہی ضرور کھڑا ملا، جو آنے جانے والوں کی طرف سے بے پروا سا نظر آتا تھا۔ پورٹیکو سے متصل برآمدے میں چھوٹی سی میز کے سامنے ایک نوجوان بیٹھا تھا، جو غالباً ریسپشنسٹ تھا۔ کل بھی میں اسی دفتر میں ڈائرکٹر اکسٹرنل پبلسٹی سے ملنے آچکا تھا، اس لیے وہ مجھے پہچان گیا اور سر کے اشارے سے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے سے میرا نام اس کے پاس آگیا ہو۔ پاس کی ضرورت نہ مجھے کل ہوئی تھی اور نہ آج۔

عمارت کی ہیئت اور وہاں کا ماحول پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ دفتر خارجہ ابھی طفولیت کے

ابتدائی دور سے گزر رہا ہے۔ نیچے کی منزل کو دیکھنے کا موقع مجھے نہیں ملا، لیکن دوسری اور تیسری منزل کے اکثر کمرے ابھی خالی ہیں۔ بعض کمروں میں فرنیچر لے جایا جا رہا تھا۔

مقررہ وقت سے پانچ ہی منٹ پہلے میں پہنچا تھا، اس لئے مجھے انتظار نہ کرنا پڑا۔ وزیر خارجہ کا کمرہ بھی سادگی کا نمونہ اور گرد و پیش کے ماحول سے مطابقت رکھتا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو دو صاحب پہلے سے موجود تھے، جن کے سامنے بہت سی فائلیں رکھی تھیں۔ غالباً متعلقہ وزارت کے اعلا افسر تھے۔ صمد صاحب نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"چند منٹ کی اجازت چاہوں گا" رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا اور کچھ خطوط پر دستخط کرنے لگے۔

"آج امریکا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کرنے والا ہے" افسروں کو رخصت کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

"یہ خبر آج صبح سے سب کی زبان ہے" میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ اس کامیابی کے لیے آپ کو مبارک باد دوں یا اظہار ہمدردی کروں!"

"مبارک باد دیجیے" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہم تو دنیا کے ہر ملک سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں کسی سے ملے آپ؟"

"آپ ہی سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کے بعد آج ہی سات بجے شیخ مجیب الرحمان سے ملنا ہے"

"وہ باہر گیے ہوے ہیں، لیکن چھ بجے تک واپس آنے والے تھے۔ آپ بہت برے وقت پر آے ہیں۔ کل سے ہر شخص بے حد مصروف ہوگا۔ عوامی لیگ کی کونسل کا اجلاس شروع ہونے والا ہے اور اس سلسلے میں کل ہی سے مختلف کمیٹیوں کے جلسے شروع ہو رہے ہیں۔ پھر چار

دن کے بعد ہماری دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس شروع ہوگا۔ اس طرح سے دس بارہ دن کوئی بھی آپ سے ملنے کی فرصت نہ نکال سکے گا"

"سب سے پہلے تو آپ ہی سے تفصیلی باتیں کرنی ہیں۔ کیوں کہ آپ ہی سے کھل کر میں باتیں پوچھ سکتا ہوں، اور شاید آپ کھل کر ان کا جواب بھی دیں گے"

"اور پھر میری گفتگو کو شایع کر کے آپ میری مٹی پلید کریں گے۔"

"نہیں میں ایسا نہیں کروں گا"

"کل صبح کو ایک کمیٹی کی میٹنگ ہے، جو غالبًا ساڑھے بارہ بجے تک ختم ہو جائے گی۔"

"کل ساڑھے گیارہ بجے مجھے تاج الدین صاحب سے ملنا ہے، اس کے بعد ساڑھے بارہ بجے تک میں یہیں آجاؤں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میٹنگ لمبی کھنچے۔ اگر وہ متوقع وقت پر ختم ہوئی تو میں تاج الدین کے یہاں ٹیلیفون کر دوں گا کہ آپ آجایئے۔"

ہماری یہ گفتگو ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اور چار پانچ صاحبان کمرے میں داخل ہوئے۔ صمد صاحب نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ بعد میں انھوں نے بتایا کہ یہ سب کسان کارکن ہیں۔

"یہ ہمارے یہاں کے مشہور اور پرانے کسان لیڈر ہیں" ایک بزرگ صورت نو وارد کا انھوں نے تعارف کرایا۔

"اور آپ کی تعریف؟" کسان لیڈر نے سوال کیا۔

"یہ دہلی سے آئے ہیں اور ہمارے برے وقتوں میں انھوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا تھا"

چند منٹ تک ان لوگوں سے رسمی گفتگو کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب صمد صاحب سے اجازت لی جایے۔

بنگلہ دیش کا موسم گرمیوں میں انتہائی ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ اکثر صاف ستھرے آسمان پر بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا یکایک نمودار ہو کر بہت بڑے طوفان کی شکل اختیار کر لیتا ہے چوتھی اپریل کو بھی یہی ہوا۔ صمد صاحب سے رخصت ہو کر ساڑھے چھ بجے میں دفتر خارجہ سے نکلا تو مطلع صاف تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا ضرور چل رہی تھی۔ پونے سات بجے جب میں شیخ مجیب الرحمان کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچا تو موسم کے بگڑنے کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ بنگلہ دیش کے بعض علاقوں میں شدید طوفان آیا ہے، جس کی وجہ سے وزیر اعظم کا ہیلی کوپٹر ڈھاکہ واپس نہیں آسکا ہے۔ اب وہ کار سے واپس آرہے ہیں اور رات کے دس بجے تک ان کے یہاں پہنچنے کی توقع ہے۔

"اب میری ملاقات کب ہو سکے گی؟" شیخ مجیب الرحمان کے سکریٹری سے میں نے سوال کیا۔

"سولہ تک وہ بے حد مصروف ہیں۔ اس کے بعد ہی ملاقات ہو سکتی ہے"

"لیکن اس سے پہلے مجھے واپس جانا ہے"

"اچھا آپ پرسوں ساڑھے آٹھ بجے شام کو آجائیے۔ لیکن آپ کو زیادہ وقت نہ مل سکے گا۔ مجمع بھی خاصا ہوگا۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ وزیر اعظم آپ کو کچھ وقت دے سکیں۔"

۶

بنگلہ دیش کی سیاسی زندگی میں آج جو لوگ بہت زیادہ 'اہمیت' رکھتے ہیں، ان میں عوامی لیگ کے بائیں بازو کے ایک مسلّمہ لیڈر تاج الدین احمد بھی ہیں۔ ان کی اہمیت کا راز یہ نہیں ہے کہ شیخ مجیب الرحمان کی حکومت میں مالیات اور منصوبہ بندی کی اہم ترین وزارتیں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ پچھلے سال اپریل سے دسمبر تک، شیخ مجیب کی عدم موجودگی میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کی کامیاب رہنمائی و سربراہی کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا:

"جمہوریہ بنگلہ دیش کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس دور کی تاریخ سے آپ واقف ہی نہیں ہیں، بلکہ آپ کو اس دور کی تاریخ کا خالق کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔"

"اس دور کی تاریخ سے تو میں یقیناً واقف ہوں،" انھوں نے جواب دیا "لیکن مجھے اس دور کی تاریخ کا خالق کہنا یقیناً صحیح نہ ہوگا۔ اس تاریخ کے خالق بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کرور عوام ہیں، جنھوں نے اپنی آزادی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی تھی۔"

مارچ ۱۹۷۰ء تک پاکستان کے باہر کم ہی لوگ تاج الدین احمد کے نام سے واقف تھے۔ پاکستان کی داخلی سیاست سے گہری دلچسپی رکھنے والوں ہی کو اس کا علم تھا کہ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے ایک جنرل سکریٹری تاج الدین بھی ہیں۔ پاکستان کے خود ساختہ سابق صدر

جنرل یحییٰ خاں اور عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمان کے درمیان مذاکرات کا جب سلسلہ شروع ہوا تو عالمی پریس میں تاج الدین احمد کا نام بھی شیخ مجیب کے دوش بدوش آنے لگا، جو اُن کے مشیر کی حیثیت سے مذاکرات میں پابندی سے حصّہ لیتے رہے تھے۔

یحییٰ خاں نے جب مذاکرات کے سلسلے کو یکایک ختم کر کے ۲۶ مارچ کو صرف ڈھاکہ ہی میں نہیں بلکہ پورے پاکستان میں "بزن" کا حکم دے کر اعلان جنگ کیا، تو عوامی لیگ کے بیشتر لیڈر اور کارکن آزادی کی جنگ کو کامیابی کی آخری منزل تک لے جانے کے لیے روپوش ہو گیے۔ ان ہی میں ایک تاج الدین بھی تھے۔

تین ہفتے تک مسلسل جنگ کے بعد مجاہدین آزادی نے ملک کے ایک چھوٹے سے حِصّے کو بالآخر دشمنوں سے آزاد کرا لیا۔ اسی آزاد شدہ علاقے میں ۱۷ اپریل کو نیشنل اسمبلی، صوبائی اسمبلی اور عوامی لیگ کونسل کے بچے کھچے ممبروں نے عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کی حکومت کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی جلسے میں شیخ مجیب الرحمان کو صدر، نذر الاسلام کو نائب صدر اور تاج الدین احمد کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ اسی آزاد سرزمین پر، جو کلکتہ سے تقریباً اسّی میل کی دوری پر واقع ہے، آم کے ایک باغ میں، بنگلہ دیش کی پہلی حکومت نے جنم لیا اور اس مقام کا نام مجیب نگر قرار پایا۔ اس دور کا پس منظر بیان کرتے ہوئے تاج الدین نے کہا:

"عوامی لیگ کا انتخابی منشور چھ نکاتی پروگرام تھا، جو نہایت صاف اور واضح تھا اور انتہائی نیک نیتی کے ساتھ متحدہ پاکستان کے اصول کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ صوبائی آزادی تو ہم یقیناً چاہتے تھے، لیکن پاکستان سے کٹ کر الگ ہونا ہماری منزل نہیں تھی۔

"اسی چھ نکاتی پروگرام کی بنا پر ہمیں ۸۰ فی صدی ووٹ ملے تھے اور نیشنل اسمبلی میں مشرقی

پاکستان کی ۱۶۹ نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستیں ہم نے حاصل کی تھیں۔ پاکستان نیشنل اسمبلی کی جملہ نشستیں ۳۱۳ تھیں۔ اس اعتبار سے نیشنل اسمبلی میں ہمیں واضح اکثریت حاصل تھی۔"

عوامی لیگ کی اسی واضح اکثریتی حیثیت نے اگر اسے عزم و اعتماد بخشا تو اسی نے مغربی پاکستان کے جنگ باز ارباب اختیار کے ہوش وحواس بھی گم کیے۔ اگرچہ انھوں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ انتخابات کے نتایج کو یحییٰ خان نے خوش آمدید کہتے ہوئے شیخ مجیب الرحمان کو پاکستان کا نامزد وزیرِ اعظم کہا۔ ان کے اس بیان کو خلوص پر مبنی سمجھا گیا۔ اسی خوش فہمی کے ساتھ یحییٰ خاں اور مغربی پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ شیخ مجیب نے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔

"مذاکرات کے آخری دور میں، جو ۱۶ مارچ سے شروع ہوا تھا، ہم تو اس پر بھی تیار تھے کہ یحییٰ خاں ہی صدر رہیں اور مرکزی حکومت بھی ان ہی کے ہاتھ میں رہے، لیکن مارشل لا ختم کر دیا جائے اور صوبوں میں اکثریتی پارٹیوں کی سول حکومت قایم کی جایے۔"

دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ ان ہی آخری مذاکرات کے دوران میں چٹاگام کی بندرگاہ پر دھڑا دھڑ فوجیں اور بے اندازہ گولہ بارود اتارا جا رہا تھا۔ ۲۴ مارچ کو، جب شیخ مجیب اور ان کے مشیر یحییٰ خاں سے آخری ملاقات کے بلاوے کا انتظار کر رہے تھے، چٹاگام کے حفاظتی گیریزن کے بنگالی آفیسر کمانڈنگ کو معطل کرکے ہوائی جہاز ڈھاکہ لایا گیا اور پھر وہ لاپتہ ہو گیا۔ غالباً اسے گولی مار دی گئی۔ ۲۵ مارچ کو رات کے گیارہ بجے فوجوں نے اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ اور باضابطہ فوجی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے۔

۷

بنگلہ دیش میں جن لوگوں سے ملنے کا مجھے مشورہ دیا گیا تھا، ان میں عوامی لیڈروں کے علاوہ کچھ پروفیسروں کے نام بھی تھے۔ چناں چہ میری ملاقات ایک پروفیسر سے ہوئی جو اب رٹائر ہو چکے ہیں۔

"کسی کا مقولہ ہے کہ جہالت بھی بڑی نعمت ہے" میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا "لیکن کبھی کبھی جہالت بڑی لعنت اور مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ پچھلے چوبیس برسوں میں عموماً اور پچھلے ایک سال میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ پاکستان کے ارباب اختیار بنگالی مسلمانوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ بنگالی مسلمان کو قوت کے زور سے دبایا نہیں جا سکتا۔ پاکستان کے جنگ بازوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سراج الدولہ کی شکست و شہادت کے بعد یہ بنگالی مسلمان ہی تھے ـــــ خصوصاً مشرقی بنگال کے مسلمان ـــــ جنھوں نے برطانوی اقتدار کو ناکوں چنے چبوائے تھے اور ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک برطانوی سامراج کا جنگی پیمانے پر مقابلہ کیا تھا۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کو بنگالی مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے لبیک کہا تھا۔ اور ان کی شہادت کے بعد بھی نصف صدی تک وہابیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر صوبہ سرحد کے دور دراز علاقے میں جا کر لڑنے والوں میں اکثریت بنگالی

مسلمانوں ہی کی ہوتی تھی۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مسٹر نارمن کو مشرقی بنگال ہی کے ایک وہابی نے برسرِ عدالت قتل کیا تھا۔ پاکستانی جنگ بازوں نے اگر سر ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندستانی مسلمان" ہی پڑھ لی ہوتی، جو تمام تر مشرقی بنگال کے مسلمانوں ہی سے متعلق ہے، تو مشرقی پاکستان میں شاید وہ کچھ وہ نہ کرتے جو پچھلے سال انھوں نے کیا ہے۔ بنگالیوں کی تاب مقاومت کو ختم کرنے کے لیے پاکستانیوں نے اپنی بری، بحری اور ہوائی طاقت لگا کر ہلاکو اور چنگیز کی تاریخ دھرا دی، لیکن بنگالیوں کو وہ زیر نہ کر سکے"۔

"آپ کے اس بیان سے میں سو فی صدی متفق ہوں، جو تاریخی حقایق پر مبنی ہے" میں نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ بنگالی عموماً اور بنگالی مسلمان خصوصاً بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ یہ بنگالی مسلمانوں کی جذباتیت ہی تھی جس نے پاکستان کے شاعرانہ تخیل کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ اگر بنگالی مسلمان میدان میں نہ ہوتے تو شاید پاکستان وجود میں نہ آتا"۔

"آپ کا یہ خیال کچھ حد تک صحیح ہے۔ بنگال ہی میں سب سے پہلے مسلم لیگ کی وزارت بنی اور بنگال ہی کے ایک فرزند نے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں پاکستان کی تجویز پیش کی۔ لیکن بنگالی مسلمان وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے جو جناح چاہتے تھے۔ ہمارے لیڈروں نے پوری کوشش کی تھی کہ بنگال تقسیم نہ ہو، اور بنگال کی ایک الگ ریاست بنا دی جائے"

"آپ کے لیڈروں نے یہ کوشش اس وقت کی جب تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا" میں نے کہا "اچھا یہ بتایئے کہ تقسیم ہند کے بارے میں یہاں لوگوں کا اب کیا خیال ہے؟"

"اب اور تب کا کوئی سوال نہیں ہے" انھوں نے جواب دیا "پاکستان کے باضابطہ وجود میں آنے سے پہلے ہی بنگالی مسلمانوں کی نظروں میں اس کی افادیت مشتبہ ہو گئی تھی قیام پاکستان کے چند ہی مہینوں بعد جب بنگالی زبان کے حق کو نظر انداز کر کے اردو کو پاکستان کی سرکاری

وقومی زبان بنایا گیا تو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے شبہات قوی تر ہو گیے۔ بلکہ انھیں بڑی مایوسی ہوی۔ متحدہ پاکستان میں مشرقی پاکستان کی اکثریتی حیثیت تھی۔ پاکستان کی آبادی کا ۵۶ فی صدی حصہ مشرقی پاکستان میں تھا۔ اس اعتبار سے پاکستان کے داخلی و خارجی معاملات میں مشرقی پاکستان کو اگر شریک غالب نہ بھی سمجھا جاتا تو کم از کم اسے برابری کا درجہ حاصل ہوتا۔ پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے حصہ ملنا چاہیے تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ پاکستان کا اقلیتی علاقہ مغربی پاکستان پورے پاکستان پر چھا گیا اور تمام مراعتیں اسی کے حصے میں آئیں، بلکہ رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی کالونی بن گیا۔ ان حالات میں کیا کسی بنگالی مسلمان کو پاکستان کے تصور کے ساتھ ذہنی یا قلبی وابستگی ہو سکتی تھی؟"

"آزادی سے پہلے جن فرقہ وارانہ مسایل کا ملک کو سامنا تھا" ایک دوسرے پروفیسر نے مجھ سے کہا "تقسیم اُن کا حل نہیں تھی۔ بلکہ اس نے مسایل کو اور بھی الجھا دیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان تو وجود میں آگیا۔ لیکن مخلص قیادت اسے نصیب نہ ہوی۔ قایداعظم کو بانی پاکستان کہا جاتا ہے اور ان ہی کی کوششوں سے پاکستان بنا بھی تھا، لیکن مسلم لیگی اور پاکستانی ہونے کے باوجود، میرا خیال ہے کہ وسعت نظر سے وہ بھی محروم تھے۔ اور ان کے بعد جو لوگ آے، ان کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی بے سود ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں اگر ایک پاکستان کی جگہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی دو الگ الگ ریاستیں بنتیں تو شاید وہ صورت حال نہ پیدا ہوتی جو اب پیدا ہوی ہے۔ اس میں کوی شک نہیں کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو مشرقی پاکستان کی ریاست مغربی پاکستان کی ریاست سے آج بہت زیادہ ترقی یافتہ بھی ہوتی۔

"مشرقی اور مغربی پاکستان کا غیر فطری اتحاد تو زیادہ دنوں تک کسی حالت میں بھی

چل نہیں سکتا تھا۔ لیکن اتنی جلد شاید ختم بھی نہ ہوتا اگر مغربی پاکستان کے ارباب اختیار نے، جن کے ہاتھ میں پورے پاکستان کی باگ ڈور تھی، حقیقت پسندی سے کام لیا ہوتا۔ پاکستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے دو شرطیں بہت ضروری تھیں، اور ان میں سے ایک بھی پوری نہ کی جاسکی۔

"پہلی شرط یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کی اکثریتی حیثیت کو تسلیم کر کے پاکستان کی سیاسی زندگی میں اسے شریک غالب بنایا جاتا۔ اسے پاکستان کا قلب و جگر سمجھا جاتا۔ پاکستانی زندگی میں فکر و عمل کے سوتے لاہور، کراچی یا اسلام آباد سے نہیں بلکہ ڈھاکہ کی سرزمین سے پھوٹتے۔ لیکن حالات نے جو روش اختیار کی وہ اس کے برعکس تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان رفتہ رفتہ پاکستان سے دور ہوتا گیا۔

"دوسری سب سے اہم شرط یہ تھی کہ ہندستان کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات ہوتے، کیوں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان خشکی کی راہ سے آمد و رفت کا سلسلہ ہندستان ہی کی دوستی سے قایم ہو سکتا تھا۔ لیکن پاکستان کی ہر حکومت نے ہندستان کے ساتھ اپنے تعلقات خراب سے خراب تر کرنے میں اپنی پیش رو حکومت پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ مشرقی پاکستان کے جن لیڈروں نے اس اہم تر ضرورت کی طرف پاکستانی لیڈروں کو توجہ دلائی انھیں ہندستان کا اجنٹ کہہ کر مردودِ پاکستان قرار دیا گیا اور ان کے حصے میں قید و بند کی زندگی آئی۔

"یہ بھی عجیب اتفاق ہے" عوامی لیگ کے ایک لیڈر نے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا "یہی یحییٰ خاں جو آج دنیا کی نظروں میں نشانِ ملامت بن گئے ہیں، ان کی ذات میں

پاکستان کو امید کی کرن نظر آئی تھی۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مشّاق طبیب کی طرح انھوں نے پاکستان کے اس اصلی مرض کو سمجھ لیا ہے کہ پچھلے بیس برسوں سے وہ سیاسی قحط سالی کا مسلسل شکار رہا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس کا جو علاج تجویز کیا، وہ بھی صحیح تھا یعنی پاکستان میں جلد سے جلد نمائندہ سول حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ یحییٰ خاں کے ہر اعلان کا ہم نے خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ہم پاکستان سے کٹ کر الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو، اور پاکستان کے دوسرے صوبوں کو بھی، مکمل اندرونی خود مختاری حاصل ہو۔ چھ نکاتی پروگرام، جو ہمارا انتخابی مینی فسٹو تھا، اس کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ پاکستان کا دستور وفاقی ہوگا، نظام حکومت پارلیمانی طرز کا ہوگا اور انتخابات بالغ رائے دہندگی کے اصول پر ہوں گے۔

"یحییٰ خاں ہماری توقع کے خلاف قومی امراض کے ماہر طبیب سے زیادہ نااہل سیاست داں نکلے۔ انھوں نے یہ سارا ڈھونگ پاکستانی عوام کو دھوکا دینے کے لئے رچایا تھا۔ وہ حکومت کو عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھیں دراصل ان کی خبر رساں اجنسیوں نے دھوکا دیا، جن کا اندازہ یہ تھا کہ پاکستان میں اگر عام انتخابات ہوئے تو پاکستان کے مغربی و مشرقی دونوں بازوؤں میں کوئی پارٹی بھی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکے گی۔ اور پھر یہ کہا جا سکے گا کہ ملک کی کسی بھی پارٹی کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہے، اس لیے فی الحال فوجی ڈکٹیٹر شپ ہی رہے گی۔ یا ایسی پارٹیوں کی ملی جلی حکومت بنائی جا سکے گی جو آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں گی اور ان پر فوجی ڈکٹیٹر شپ مسلط رہے گی۔

"انتخابات کے نتائج یحییٰ خاں اور ان کے فوجی مشیروں کی توقع کے خلاف نکلے۔ اس نے ان کے حواس تو گم کیے، لیکن اپنی روش میں بظاہر انھوں نے تبدیلی نہ آنے دی۔ عوامی لیگ

کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ان کی گفت و شنید کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا جو صرف اسی لیے رچایا گیا تھا کہ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ فوجیں منتقل کرنے کا موقع مل جائے۔

"شیخ مجیب الرحمان اور ان کے ساتھیوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ انتخابات میں ان کی پارٹی کو ۹۹ فی صدی کامیابی نصیب ہوئی ہے، اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کے عوام نے ایک مہینے تک عدم تعاون کی تحریک کامیابی کے ساتھ چلا کر مکمل اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے پیشِ نظر پاکستان کی فوجی حکومت بڑے پیمانے پر جارحانہ اقدام کرنے کی ہمت نہ کرے گی۔ دوسری طرف یحییٰ خاں اور ان کے مشیروں کو یہ گمان تھا کہ ان کے جارحانہ اقدام کے خلاف احتجاجاً اگر مشرقی پاکستان نے مرکز سے کٹ کر خود مختاری کا اعلان کیا تو پاکستانی فوج کو حرکت میں لا کر ایک ہفتے میں وہ صورت حال پر قابو پا لیں گے۔ لیکن اس معاملے میں شیخ مجیب الرحمان اور یحییٰ خاں دونوں کے اندازے غلط نکلے۔ یحییٰ خاں نے وہ کیا جس کی امید نہ تھی، دوسری طرف مشرقی بنگال کے عوام نے یحییٰ خاں کے منصوبوں کو ملیامیٹ کر دیا۔"

ڈھاکہ میں سیاسی اجتماعات کے لیے ریس کورس میدان بھی خاصا مشہور ہے۔ شیخ مجیب الرحمان پاکستان سے رہا ہو کر جب ڈھاکہ پہنچے تھے تو اسی میدان میں ان کا عوامی استقبال کیا گیا تھا۔ وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کا استقبالیہ جلسہ بھی اسی میدان میں ہوا تھا۔ ایک روز شام کو میں اس طرف سے گزرا تو بڑی چہل پہل اور سرگرمی کے آثار وہاں نظر آئے۔ پورا میدان کاغذ کی جھنڈیوں اور کپڑے کے بڑے بڑے جھنڈوں سے سجایا جا رہا تھا۔ بنگلہ دیش کے لیڈروں کی تصویریں بھی جا بہ جا لٹکائی جا رہی تھیں۔

"یہاں کوئی کانفرنس ہونے والی ہے؟" اپنا تعارف کرانے کے بعد ایک نوجوان سے میں نے سوال کیا، جو وہاں انتظام میں پیش پیش تھا۔

"ہاں، کل اسی جگہ اسٹوڈنٹس کنونشن ہوگا"

"اسٹوڈنٹس کا یا کسی سیاسی پارٹی کا؟"

"بنگلہ دیش کی سیاسی زندگی میں" نوجوان نے جواب دیا "طالب علموں کی تنظیموں کو سیاسی پارٹیوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔"

"یہ کیوں؟"

"اس کی وجہ یہ ہے" ایک دوسرے نوجوان نے جواب دیا، جو پاس ہی کھڑا تھا "بنگلہ دیش کو آزاد کرانے میں ہمارا حصہ سیاسی پارٹیوں سے کم نہیں، زیادہ ہے۔" پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا "یہ پوسٹر دیکھ رہے ہیں آپ! اس میں بنگلہ دیش کے چار قومی لیڈروں ـــــ شیخ مجیب الرحمان، پروفیسر مظفر احمد، مونی سنگھ اور مولانا بھاشانی ـــــ کے نام لکھے ہیں۔ یہ چار لیڈر چار پارٹیاں ہیں ـــــ عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی (مظفر گروپ)، کمیونسٹ پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) لیکن جنگ کے دنوں میں بنگلہ دیش کا ایک بھی قومی لیڈر یہاں نہیں تھا۔ پاکستانی فوج کا مقابلہ تو ہم طالب علموں ہی نے کیا ہے۔ یہی ہماری اہمیت کا راز ہے۔ ہمارے لیڈر بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں کہ جس آزادی کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے اپنا خون بہایا ہے، اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ہم اتنی ہی قربانی کر سکتے ہیں۔"

نوجوان طالب علم کا یہ دعوا بڑی حد تک صحیح تھا۔ یہ باتیں سن کر ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ساتھ اپنی ملاقات مجھے یاد آئی۔ انھوں نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ

"۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب یحییٰ خاں نے 'برزن' کا حکم دیا تو پاکستانی بربریت و بہیمیت کا نشانہ سب سے پہلے، اور سب سے زیادہ، ڈھاکہ یونیورسٹی ہی بنی، اور اس کا سلسلہ پندرہ دسمبر تک جاری رہا۔ اب تک جو اعداد و شمار بہم پہنچے ہیں۔ ان کے مطابق ایک ہزار طالب علم مارے گئے۔ ان کے علاوہ انتیس استاد، ایک میڈیکل آفیسر، ایک کلرک اور ۲۵ چوتھے درجے کے ملازمین موت کے گھاٹ اتارے گئے۔" ان حالات نے قدرتی طور پر طلبا کے سیاسی وزن ہی کو نہیں، ان کے اثر و رسوخ کو بھی بہت بڑھا دیا ہے، جسے کچھ لوگ خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال "مجیب کے چار خلیفہ" کا طنز آمیز فقرہ ہے، جو ڈھاکہ میں سیاسی شعور رکھنے والے حلقوں میں ضرب المثل بن بن گیا ہے۔

"خدا کا شکر ہے" ایک اعلا سرکاری افسر نے میری موجودگی میں اپنے ایک رفیق سے کہا "میرے شعبے میں چار کیا ایک خلیفہ بھی نہیں ہے، ورنہ میں تو استعفا دے کر بھاگ کھڑا ہوتا۔" یہ جملہ سن کر مجھے ہنسی آگئی۔

"آپ بھی اس فقرے کی معنویت سے شاید واقف ہیں" مجھے ہنستے دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "چار خلیفہ کا اشارہ یونیورسٹی کے چار طالب علم لیڈروں کی طرف ہے، جن کے متعلق لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ شیخ مجیب الرحمان پر حاوی ہیں اور جو چاہتے ہیں ان سے کرا لیتے ہیں۔"

۷

بنگلہ دیش کی سیاسی پارٹیوں کے جن لیڈروں اور کارکنوں سے میں ملا، ان میں نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن سے ایک نہیں بلکہ دو بار میری ملاقات ہوی۔

برِصغیر ہند میں راج گوپال آچاریہ کے بعد مولانا بھاشانی ہی سب سے زیادہ سیاسی تجربہ رکھنے والے لیڈر ہیں۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) سے لے کر تقسیم پاکستان (۱۹۷۱ء) تک تمام سیاسی تحریکوں میں انھوں نے عملی حصّہ لیا ہے۔ خود انھوں نے مجھے بتایا کہ "پچھلے دسمبر کی پندرہ تاریخ" ان کی زندگی کے "نوے سال پورے ہو چکے ہیں"۔ راجا جی کی عمر ۹۴ سال ہے اور کئی برس سے سیاسی زندگی کی سرگرمیوں سے عملاً وہ کنارہ کش ہو چکے ہیں اگرچہ ہمارے ملک کی بعض سیاسی پارٹیاں آج بھی انھیں تبرکاً استعمال کر لیتی ہیں۔ لیکن بھاشانی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بنگلہ دیش کی سیاسی زندگی میں آج بھی وہ ایک فعال عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پبلک جلسوں میں مائک کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے وہ تقریر کرتے ہیں، اور ابتدا سے انتہا تک ان کی پاٹ دار آواز میں تھکن یا کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔

مولانا بھاشانی سے میری پہلی ملاقات بالکل غیر متوقع طور پر ڈھاکہ کے فیشن ایبل علاقے،

دھان منڈی کے ایک مکان میں ہوی جس کی داخلی ہیئت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ یہ متوسط طبقے کے کسی فرد کی ملکیت ہے۔ ڈھاکہ کے سیاسی حلقوں میں تو یہ خبر کئی دن سے گرم تھی کہ اتوار کے دن ایک جلسے میں تقریر کرنے کے لئے مولانا بھاشانی ڈھاکہ آئیں گے۔ نویں اپریل کے اخباروں نے بھی اس 'اطلاع' کو نمایاں کر کے چھاپا کہ آج سہ پہر کو تین بجے پلٹن میدان میں مولانا بھاشانی تقریر کریں گے۔ چناں چہ اس دن کا جو پروگرام میں نے بنایا، اس کے مطابق دو ہی کام مجھے کرنے تھے۔ پہلے وقت اپنی واپسی کی سیٹ بک کرانا اور دوسرے وقت مولانا بھاشانی کے جلسے میں جانا۔

انڈین ایرلائنز کا دفتر موتی جھیل میں ہے، جسے 'کمرشل ایریا' (کاروباری علاقہ) کہتے ہیں۔ یہاں بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور ملکی و غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ اسے اونچی اونچی عمارتوں کا چھوٹا سا شہر کہنا غلط نہ ہوگا۔ کل، اور کل سے پہلے بھی دو ایک بار، جب اس طرف میرا گزر ہوا تو یہاں بڑی چہل پہل نظر آئی۔ لیکن آج اتوار تھا، اس لئے ہر طرف سناٹا ـــــ وحشت ناک سناٹا ـــــ نظر آیا اور یہ علاقہ صحیح معنوں میں شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔

سیٹ بک کرانے کے بعد ایرلائنز کے دفتر سے نکلا تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر دور دور تک کوی آٹو یا سائیکل رکشا نظر نہ آیا۔ سواری کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یکایک خیال آیا کہ پلٹن میدان کی طرف چلا جائے، جو زیادہ دور نہیں ہے۔ ممکن ہے وہاں کوئی ایسا آدمی مل جائے، جس سے مولانا بھاشانی کا پتا لگ سکے۔ کل جب میرا اس طرف گزر ہوا تو ایک 'گائیڈ' بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ یہیں سے مجھے ایک بڑے مارکیٹ میں لے گیا تھا، جو 'بیت المکرم' ـــــ ڈھاکہ کی جدید ترین اور عظیم ترین مسجد ـــــ کے اردگرد بنایا گیا ہے۔ وہیں ایک ہوٹل میں ہم لوگوں نے دن کا کھانا بھی کھایا تھا۔ ہوٹل سے ہم نکلے

تو میرے رفیق نے ایک بڑے سے میدان کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا: "یہ پلٹن میدان ہے یہیں کل بھاشانی تقریر کریں گے۔"

یہ باتیں یاد آتے ہی میں چل پڑا۔ راستہ بالکل سیدھا تھا اور فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ بارہ پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ کل یہ جگہ سنسان پڑی تھی، لیکن آج زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ میدان کے ایک سرے پر اونچا سا ڈائس بنایا گیا تھا، اس کے گرد بانس کی حد بندی بنائی جارہی تھی۔ قریب ہی کچھ لوگ کھڑے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔

"میں ہندستانی اخبار نویس ہوں" ایک صاحب سے میں نے کہا "اور آج کے جلسے کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں"

"اُن سے بات کیجئے" میرے مخاطب نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ آگے بڑھ کر ان سے بھی میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرا نام مجیب الرحمان چشتی ہے" انھوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا "ڈھاکہ نیشنل عوامی پارٹی کی ایڈہاک کمیٹی کا کنونیر ہوں"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بالکل صحیح آدمی کے پاس آیا ہوں" میں نے کہا "مجھے مولانا بھاشانی سے ملنا ہے اور آپ ہی کی وساطت سے یہ کام انجام پا سکتا ہے"

"کچھ دیر پہلے تک مولانا ڈھاکہ پہنچے نہیں تھے" چشتی نے جواب دیا "اب یا تو پہنچ گئے ہوں گے یا پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ان کی تلاش شروع کروں گا۔ آپ بھی چلئے میرے ساتھ"

اس گفتگو کے بعد چشتی مجھے ساتھ لے کر ڈائس پر چڑھ گئے۔ ہم دونوں نے باتیں شروع ہی کی تھیں کہ ایک والنٹیر چائے اور بسکٹ لے آیا جس کا آرڈر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے

ہی دیا جا چکا تھا۔

"یہ میدان جو آپ کے سامنے ہے" بخشی نے مجھے بتایا "بڑا تاریخی میدان ہے۔ یہاں بڑے بڑے جلسے ہوئے ہیں۔ مولانا تو ہمیشہ یہیں تقریر کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے آزاد ہونے سے سولہ سال قبل اسی میدان میں پاکستان سے تعلقات منقطع کرنے کا انھوں نے اعلان کرتے ہوئے پاکستان کو 'سلام علیکم' ــــ رخصتی سلام علیکم کہا تھا۔ پچھلے سال جب پاکستان نے مشرقی پاکستان کو میدانِ جنگ بنا دیا تو اسی میدان میں مولانا نے "شوادِھین (آزاد) بنگلہ دیش" کے قیام کا اعلان کیا۔ اسی میدان میں پچھلے اتوار کو بھی بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ مولانا جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اور وہ آٹھ منٹ سے زیادہ نہ بول سکے۔ آج پھر اسی میدان میں وہ بولیں گے۔"

"پچھلے اتوار کے جلسے میں بھی میں آنا چاہتا تھا" میں نے کہا "لیکن ایک ہی دن پہلے یہاں پہنچا تھا۔ ساتھی کوئی ملا نہیں اور تنہا آنے کی ہمت نہ ہوئی"

"آج آپ کسی کے ساتھ آئے تھے؟"

"آج تو اکیلا ہی آیا ہوں" میں نے جواب دیا "ایک ہفتے تک ڈھاکہ کی سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد اب آزادانہ ہر جگہ اکیلا آتا جاتا ہوں۔"

ہم لوگوں نے چائے ابھی ختم ہی کی تھی کہ مولانا بھاشانی کا پتا لگانے کے لیے ایک صاحب اور وہاں پہنچ گئے۔ پھر ہم دونوں بھی ان ہی کی گاڑی میں مولانا بھاشانی کی جستجو میں نکلے۔ پہلے ہوٹل پوربنی گئے جہاں اکثر مولانا قیام کرتے ہیں۔ وہاں وہ ملے تو نہیں، لیکن وہیں سے ان کا پتا لگ گیا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے۔ اس وقت وہ کھانے سے فارغ ہو کر

ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے جارہے تھے جو اس کمرے سے متصل ہی تھا جہاں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ میری کرسی اتفاقاً ایسی جگہ پر تھی جہاں سے میں انھیں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بلا کسی سہارے کے وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف گئے۔ چال ڈھال اور صورت شکل سے مجھے تو وہ جوانوں سے جوان تر معلوم ہوئے۔ غسل خانے سے نکل کر چند منٹ کے لیے وہ اسی کمرے میں واپس آگئے جہاں کھانا کھایا تھا۔ پھر اس طرف آئے جہاں میں اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میری بابت انھیں معلوم ہو چکا تھا، اس لیے وہ پہلے مجھ ہی سے مخاطب ہوئے۔

"یہ معلوم کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں کے حالات دیکھنے آپ دہلی سے تشریف لائے" مصافحہ کرنے کے بعد اردو میں انھوں نے اس بے تکلفی سے کہا، جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہوں۔ ان کی آواز اور ان کے لہجے میں بات چیت سے زیادہ تقریر کا سا انداز تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے علاوہ ان کے بہت سے معتقدین بھی کمرے میں موجود تھے۔ مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع انھوں نے نہ دیا اور اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھا

"آپ کے ملک کے رہنے والوں کے، آپ کے ملک کی حکومت کے اور آپ کے جوانوں کے ہم بے حد ممنون ہیں، جنھوں نے مصیبت کے وقت ہمارا ساتھ دیا۔ اس احسان کے لیے ہماری سات پشت آپ کی ممنون رہے گی۔ لیکن یہ آپ کے مارواڑی جو یہاں آگیے ہیں، انھیں تو آپ لے جاییے"

یہ ساری باتیں مولانا بھاشانی نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔ ان کے لہجے میں احسان مندی سے زیادہ مجھے تلخی محسوس ہوی۔ آج کل جن خطوط پر ان کا ذہن کام کر رہا ہے اس کا، اور لوگوں کی وساطت سے، چوں کہ مجھے کچھ علم ہو چکا تھا اس لیے ان کی

باتیں سن کر مجھے حیرت نہ ہوی۔

"ہندستانی عوام، ہندستانی حکومت اور ہندستانی جوانوں کے بارے میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے، ایک ہندستانی شہری کی حیثیت سے، میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں" میں نے بے تکلفی کے ساتھ جواب دیا "لیکن مولانا! مارڑواڑی والی جو بات آپ نے فرمائی ہے، وہ حقایق پر نہیں، شاید غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ ایک ہفتے سے میں ڈھاکہ میں ہوں اور شہر کا چپہ چپہ میں نے چھانا ہے، مگر مجھے تو ایک مارڑواڑی بھی شہر میں نظر نہ آیا۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے، مارڑواڑی ہی نہیں، اس نوع کے تمام کاروباری افراد کے بنگلہ دیش آنے پر حکومت ہند نے کڑی پابندی لگادی ہے۔"

یہ تھی مولانا بھاشانی سے میری پہلی ملاقات جو غیر دوستانہ ماحول میں نوک جھونک سے شروع ہوئی۔ لیکن جلد ہی ہماری گفتگو کی روش بدل گئی۔ کمرے میں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا، اس لئے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا میں نے نامناسب سمجھا۔

"بنگلہ دیش کی موجودہ صورت حال پر میں کتاب لکھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "اور اس سلسلے میں آپ کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کے لیے آپ سے تفصیلی باتیں کرنا ضروری ہے اگر آپ کچھ وقت دے سکیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔"

"اس کے لیے تو آپ کو سنتوش آنا ہوگا" مولانا نے جواب دیا "آج جلسے کے بعد ہی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"میں یہاں ۱۲ تک ہوں اور ۱۳ کی صبح کو روانہ ہونا ہے۔ کل مجھے یہاں دو صاحبوں سے ملنا ہے۔"

"تو پرسوں آجایئے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پرسوں میں آجاؤں گا"

"تو پرسوں ۱۱ تاریخ میں آپ کا انتظار کروں گا"

"میں ضرور آؤں گا"

پونے تین بجے پلٹن میدان پہنچا تو وہ کھچا کھچ بھر چکا تھا، لیکن اس حصے تک پہنچنے میں زیادہ دقّت نہ ہوئی جو پریس کے لیے مخصوص تھا۔ منتظمین کے بیان کے مطابق مجمع ڈیڑھ لاکھ سے اوپر تھا، لیکن میرے تخمینے کے مطابق ایک لاکھ کے لگ بھگ لوگ رہے ہوں گے۔ لباس اور وضع قطع سے بڑی اکثریت نچلے طبقے کے لوگوں کی تھی۔ باقی متوسط طبقے کے تھے۔ ڈائس کے ارد گرد کثیر تعداد میں والنٹیر تھے، جن کے سروں پر لال ٹوپی اور بازوؤں پر لال ہی رنگ کی چوڑی چوڑی پٹیاں تھیں۔ ان میں بیشتر نوجوان اور کم سن لڑکے تھے۔ ان کی ٹولیاں حلقے بنا کر کورس کے انداز میں نعرے لگا رہی تھیں:

"بنگلہ دیش! بنگلہ دیش!"

"لال سلام! لال سلام!"

"دُنین مزدوز ایک ہو (دنیا کے مزدور ایک ہو)"

"دُنین مظلوم ایک ہو (دنیا کے مظلوم ایک ہو)"

"لوٹ پاٹ سمیتی چلبے نا، چلبے نا (لوٹ کھسوٹ سمیتی نہیں چلے گی، نہیں چلے گی)"

ان کے علاوہ کچھ اور بھی نعرے تھے۔ مثلاً

"کھ ٹی سوشلزم (خالص سوشلزم) قایم کرو"

"بلا مقدمہ چلائے کسی کو جیل میں بند مت کرو"

"جمہوریت پسندوں کو گرفتار نہ کرو"

جلسے کی بےضابطہ کارروائی تو تین بجے شروع ہوگئی، لیکن باضابطہ کارروائی مجیب الرحمان بھنی کی صدارت میں ساڑھے تین بجے مولانا بھاشانی کی آمد کے بعد شروع ہو سکی۔ بےضابطہ، باضابطہ کارروائی کے درمیانی وقفے میں دو بنگلہ کی نظمیں پڑھی گئیں اور ایک صاحب تقریر کرتے رہے، جو میں بالکل سمجھ نہ سکا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ ایک سابق اسٹوڈنٹ لیڈر راشد خاں ہیں، جو آج باضابطہ لنگر لنگوٹ کس کر سیاست کے میدان میں اترے ہیں۔ جلسے کی کارروائی حسب توقع بنگلہ میں ہوئی، اس لئے وہاں میری حیثیت اس شخص کی سی تھی جو انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود انگریزی فلم دیکھ رہا ہو۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد راشد خاں نے ایک طویل تجویز پڑھ کر سنائی اور کہا کہ مولانا اس تجویز کی تشریح بیان کریں گے۔

مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مجمع نے تالیاں بجا کر اور نعرے لگا کر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ان کی تقریر کی زبان نسبتاً مجھے آسان معلوم ہوئی کیوں کہ اس میں اردو کے الفاظ کی بھی خاصی آمیزش تھی۔ اس لیے جگہ جگہ سے ان کی تقریر کا مفہوم میری سمجھ میں بھی آیا۔ سب سے بڑھ کر مقرر کا لب ولہجہ اور انداز بیان، جو انتہائی طنزیہ تھا، تقریر کی تشریح کر رہا تھا۔ چناں چہ میں یہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ حکومت پر شدید نکتہ چینی کرنے کے علاوہ روس اور ہندستان کی بھی وہ خبر لے رہے ہیں۔

اس جلسے میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی، یہ تھی کہ تقریر کرتے کرتے مولانا بھاشانی نے مائک کے سامنے ہی عصر کی نماز کی نیت باندھ دی اور مجمع یکایک اکھڑ گیا۔ نہ تو وہ تجویز ہی پاس ہوئی جو شروع میں پیش کی گئی تھی، اور نہ صدر جلسہ نے ایک لفظ کہا۔

اصل حقیقت دوسرے دن معلوم ہوئی، جو یہ تھی کہ بنگلہ دیش کی دستور ساز اسمبلی کی قانونی حیثیت پر اعتراض کرتے ہوئے مولانا بھاشانی نے کہا تھا کہ یہ چھ نکاتی پروگرام کے تحت منتخب ہوئی تھی، جس کی بنیاد متحدہ پاکستان کا اصول تھا۔ آزاد بنگلہ دیش کا دستور بنانے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اب جب کہ بنگلہ دیش آزاد ہو چکا ہے تو دستور ساز اسمبلی کا انتخاب از سرِ نو عمل میں آنا چاہیے لیکن وہ اپنی بات بھی پوری نہ کرنے پائے تھے کہ مجمع منتشر ہونے لگا۔ کیوں کہ سننے والوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ آزاد و خود مختار بنگلہ دیش کی مخالفت اور پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں ــــ اس قصے سے آج کے بنگلہ دیش کے سیاسی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا بھاشانی کی تقریر کی تفصیلات پڑھ کر اور سن کر اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کی حکومت کے سب سے بڑے حریف مولانا بھاشانی ہی ہیں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ ان تمام سیاسی حربوں کو استعمال کریں گے جو ان کے ہاتھ آئیں گے۔

مولانا بھاشانی کے سیاسی کردار کے اس پہلو کو اگر سامنے رکھا جائے کہ ان کی ساری زندگی 'اپوزیشن'، (Opposition) ہی میں گزری ہے تو موجودہ حکومت سے ان کی مخالفت کا راز بڑی حد تک سمجھ میں آجاتا ہے۔ برطانوی سامراجی دور سے قطع نظر، مسلم لیگ میں بھی ان کا تعلق اس بائیں بازو سے رہا، جو مسلم لیگ کی داخلی سیاست میں اپوزیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس ملک کے ارباب اختیار نے سارے پاکستان میں ــــ خصوصاً مشرقی پاکستان میں ــــ سیاسی و اقتصادی استحصال کی جو گرم بازاری کر رکھی تھی، اس کی مخالفت بھی مولانا بھاشانی نے ڈٹ کر کی، اور اس کا سلسلہ بائیس سال تک جاری رہا۔

مخالفت اب ان کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ فطرتاً وہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے مخالفت کرتے وقت وہ حد اعتدال سے بھی پرے نکل جاتے ہیں۔ اب وہ عمر کی اس منزل میں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کی فطرت کا یہ سانچہ اس درجہ پختہ ہو چکا ہے کہ وہ نہ تو ٹوٹ سکتا ہے اور نہ بدل ہی سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس آزاد و خود مختار بنگلہ دیش میں جس کی آزادی و خود مختاری کا نعرہ بھی سب سے پہلے مولانا بھاشانی ہی نے لگایا تھا، وہ آج اپوزیشن میں ہیں۔ جمہوری نظام میں 'اپوزیشن' کا وجود ہی جمہوریت کی بقا کا ضامن ہوتا ہے، لیکن مخالفت برائے مخالفت، وہ بھی بنگلہ دیش جیسے نوآزاد ملک میں، انتہائی مضرت رساں بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

مولانا بھاشانی سے میری دوسری ملاقات ان کے مرکز سنتوش میں ہوئی اور ساڑھے تین گھنٹے تک مسلسل جاری رہی، بلکہ اپنے ارادے کے برعکس رات بھی مجھے ان ہی کی جھونپڑی نما رہایش گاہ میں گزارنی پڑی۔ اس ملاقات کے وقت ان کے اور میرے سوا کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔

سنتوش ٹانگیل کے ضلع میں ہے اور ڈھاکہ سے اس کا فاصلہ سو کلومیٹر ہے۔ ایک کرم فرمانے وہاں تک جانے کے لئے گاڑی فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا، بلکہ اسی امید پر میں نے سنتوش جانے کا پروگرام طے کیا تھا۔ لیکن عین وقت پر انھوں نے معذوری ظاہر کی۔ مگر دوستوں کی مخالفت کے باوجود میں نے طے شدہ پروگرام کو فسخ کرنا مناسب نہ سمجھا اور سنتوش تک تنہا سفر کیا۔

مجیب الرحمان چشتی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ بس صبح سات بجے ڈھاکہ کے پرانے ریلوے

اسٹیشن سے روانہ ہو کر دس بجے ٹانگیل پہنچتی ہے۔ وہاں سے سنتوش دو میل ہے۔ رکشے آسانی سے مل جاتے ہیں جو آدھ گھنٹے میں سنتوش پہنچا دیتے ہیں۔ یہ معلومات بڑی حد تک صحیح تھیں۔ ہماری بس گیارہ بجے ٹانگیل پہنچی۔ بس کے لیٹ ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ راستے میں جتنے بھی پل ملے، ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اس پر سے بس گزر سکے۔ ندی نالے خشک تھے اس لیے زیادہ زحمت نہ ہوئی۔ صرف ایک جگہ خاصا پانی تھا اور وہاں بس کو پلیٹ فارم نما موٹر بوٹ سے دریا کو پار کرنا پڑا۔ ساڑھے تین گھنٹے کے اس سفر میں نہ تو میں کسی سے مخاطب ہوا اور نہ کسی نے مجھ سے بات کی۔

سنتوش جب میں پہنچا تو مولانا اسی وقت کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا اور ایک بڑے سے چھپر میں لے گئے، جہاں دو تین لکڑی کی کرسیاں اور اسی طرح کی ایک میز پڑی تھی۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک آدمی تربوز کے چار بڑے بڑے ٹکڑے ایک پلیٹ میں رکھ کر لایا۔ میں پیاسا تھا اس لئے یہ تربوز بڑی نعمت معلوم ہوئے۔ کچھ دیر بعد وہی آدمی کھانا بھی لے آیا۔ کھانے میں تلی ہوئی اور شوربے دار مچھلی کے ساتھ چاول تھے۔

"روٹی پکانا یہاں کوئی نہیں جانتا" مولانا نے معذرت کی "میری بیوی روٹی پکا لیتی ہے، وہ یہاں ہے نہیں۔"

مچھلی بہت مزے کی تھی۔ چاول البتہ بہت موٹے تھے، اتنے موٹے کہ ان کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ ایک کوئی ترکاری بھی تھی۔ مولانا نے آدمی سے بنگلہ میں کچھ کہا اور اس نے ایک پیالے میں مرغی بھی لا کر رکھ دی۔ میں نے مولویانہ انداز میں 'مرغ و ماہی' سے پیٹ بھرا۔ کھانے کے بعد ایک پلیٹ میں جم جم آئے، جو بے حد لذیذ تھے۔ میں نے

اتنے اچھے کلکتہ یا ڈھاکہ میں بھی نہیں کھائے تھے۔ پانی البتہ بہت خراب تھا۔ اس میں مچھلی کی تیز بو تھی، جیسے تالاب کا پانی ہو۔

سنتوش گاؤں ہے، صحیح معنوں میں گاؤں۔ شہر سے صرف دو میل کی دوری پر واقع ہونے کے باوجود شہری زندگی کی آسائشوں کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے — نہ بجلی، نہ ٹیلی فون، نہ نل کا پانی۔ وہاں کے سادہ اور بے رنگ ماحول کو دیکھ کر اس دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جب بہ قول حالیؔ:

دشتِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں

اسی مقام کو مولانا بھاشانی بنگلہ دیش کی سماجی و مذہبی زندگی کا ایک ایسا مرکز بنانے کے آرزومند ہیں، جہاں اسلام کے دیرینہ خواب کی جدید تعبیروں کی جستجو کی جا سکے، یا بہ الفاظِ دیگر اسلام کے قدیم نظام کو زندگی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے "قرآن و حدیث کی جدید تفسیریں" لکھی جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ وسیع پیمانے پر ایک "اسلامک یونیورسٹی" کی داغ بیل ڈالنے کے درپے ہیں۔

"آپ کی باتیں سن کر ایک سوال میرے ذہن میں کروٹیں لے رہا ہے،" میں نے کہا "اور وہ یہ ہے کہ آپ میں اور مولانا مودودی میں کیا فرق ہے؟"

"مودودی روایت پرست اور رجعت پرست ہے،" انھوں نے بے دھڑک جواب دیا۔ "اور میں اسلام کا سائنٹی فک تجزیہ چاہتا ہوں۔"

مولانا بھاشانی کے بیان کے مطابق "بنگلہ دیش میں ۹۶ ہزار مسجدیں ہیں" انھیں وہ فریضۂ نماز کی ادائیگی ہی تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے۔ بنگلہ دیش 'مچھی' کا دیس ہے اور وہاں سے مچھلی برآمد بھی کی جاتی ہے۔ اس کاروبار کو فروغ دینے کے لئے ان

"۹۶ ہزار مسجدوں سے افزائش ماہی کی تربیت گاہ کا بھی کام لیا جا سکتا ہے"

بنگلہ دیش کے لیڈروں میں مولانا بھاشانی ہی ایک ایسے لیڈر ہیں، جن کے سیاسی رجحانات متنازعہ فیہ ہیں۔ اب تک انھیں پکا کمیونسٹ سمجھا جاتا رہا ہے، اور ان کا ناتا ان چینی کمیونسٹوں سے جوڑا جاتا رہا ہے، جو کمیونزم کے اپنے عقیدے میں دہابیوں سے کم کٹر نہیں ہوتے۔

مولانا بھاشانی اپنے متعلق بہت کم گفتگو کرتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے پیہم سوالوں کے جواب میں اپنے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا اس میں میرے لیے سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ مولانا بھاشانی کی پہلی سیاسی تربیت گاہ دہشت پسندی کا اسکول تھا، اور اپنے اس ابتدائی دور میں انھوں نے دس بارہ انگریز افسروں کو کامیابی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہندستان میں دہشت پسندی کی تحریک تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) سے شروع ہوئی۔ اس وقت بھاشانی کی عمر ۲۴ یا ۲۵ سال کی رہی ہوگی۔ اسی دور سے انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز دیہاتوں کو بنایا۔ اور پھر ان کی ساری زندگی کسانوں ہی میں گزری۔

"دینی یا دنیوی تعلیم میں نے باضابطہ حاصل نہیں کی ہے" انھوں نے مجھے بتایا "لیکن میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کا شاگرد ہوں، میں ان کے درس میں شریک ہوا ہوں" مولانا حسین احمد کے علاوہ جن علما کا انھوں نے اثر قبول کیا، ان میں مولانا آزاد اور مفتی کفایت اللہ کے نام بھی وہ لیتے ہیں۔

بھاشانی کی کمیونزم کی تعلیم کا حال بھی دینی تعلیم سے مختلف نہیں ہے۔ عملی تجربے نے

ان کو بہت کچھ سکھایا ہے، لیکن کمیونزم کے نظریاتی پہلو پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اگر وہ کمیونسٹ ہیں، تو یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ کمیونزم پر وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ بہر کیف اس کا فیصلہ بہت دشوار ہے کہ وہ کمیونسٹ ہیں یا نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے بتیس چالیس برسوں سے برصغیر کی ترقی پسند سیاسی تحریک سے، خصوصاً کسانوں کی تحریک سے وہ وابستہ رہے ہیں۔ تقسیم سے قبل آسام میں اور تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں انھوں نے کامیابی کے ساتھ کسانوں کی تحریکیں چلائی تھیں۔ آج بھی انھیں بنگلہ دیش کے کسانوں میں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ اب تک انھیں یقیناً کمیونسٹ سمجھا جاتا رہا ہے اور کمیونسٹ چین کے ساتھ بھی انھیں جذباتی وابستگی رہی ہے۔ لیکن مجھ سے انھوں نے ماسکو ہی کی نہیں، پی کنگ کی بھی جی بھر کے برائی کی اور ان دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی سماجی و مذہبی زبوں حالی کا رونا رویا۔ مگر اس کے ساتھ ہی آج بھی وہ اپنی تقریروں میں "کھاٹی (خالص) سوشلزم" کے قیام کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔

مولانا بھاشانی کو اس حقیقت کا بھی کُلّی احساس ہے کہ "بنگلہ دیش کی ۸۵ فی صدی آبادی مسلمان ہے"، جو ان پڑھ اور جاہل ہے، اسے مذہب کے نام پر بہ آسانی متحرک کیا جا سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کی اسی حقیقت کو وہ آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

"آج ہمیں اسلامزم اور کمیونزم میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے"۔ یہ الفاظ مولانا بھاشانی ہی کے ہیں، جو انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے کہے تھے۔ ان کے انداز بیان میں جذباتیت نہیں تھی، عزم و اعتماد تھا۔ یہ حقیقت بھی انھوں نے بڑی حد تک واضح کر دی تھی کہ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے، انھوں نے "اسلامزم" کا انتخاب کیا ہے۔ ساتھ ہی انھیں اس کا بھی کُلّی یقین ہے کہ بنگلہ دیش کی ۸۵ فی صدی مسلم آبادی کی اکثریت

ان کا ساتھ دے گی۔

مولانا بھاشانی کے یہ خیالات شاید ڈھکے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے ہم عصر لیڈر بھی اِن سے بہ خوبی واقف ہیں ــــ اور ان کے ان خیالات سے بنگلہ دیش کی سیاست میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ان کا اندازہ لگانا بھی ان کے حریفوں کے لیے دشوار نہیں۔ غالباً اسی بنا پر وہ ان کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔

"بھاشانی نہ مولانا ہے اور نہ کمیونسٹ" ان کے ایک مخالف لیڈر نے نہایت پُرجوش انداز میں مجھ سے کہا "وہ صرف موقع پرست ہے۔ قرآن میں جو منافق کا لفظ آیا ہے، وہ اس کی صحیح تفسیر ہے۔"

مولانا بھاشانی کا ذہن بعض معاملات میں واضح نہیں ہے۔ ان ہی میں ایک مسئلہ اسلامک یونیورسٹی کا بھی ہے، جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے سے قبل وہ "عربک یونیورسٹی" بنانے کے درپے تھے۔ اس کے لیے ایک وسیع قطعہ اراضی بھی انھوں نے سنتوش ہی میں حاصل کر لیا تھا، جو آج بھی ان کے تصرف میں ہے۔ اب اسی اسکیم کو انھوں نے اسلامک یونیورسٹی کا نام دے دیا ہے۔

"وہاں کس قسم کی تعلیم دی جائے گی؟" میں نے سوال کیا "وہ دیوبند کے انداز کی ہو گی یا علی گڑھ کے طرز کی؟"

"وہ مدرسہ نہ ہو گا، یونیورسٹی ہو گی" انھوں نے جواب دیا "وہاں دینی و دنیوی دونوں علوم کی تعلیم دی جائے گی، اور جدید طرز پر دی جائے گی۔ طالب علموں کے رہنے کا بھی وہیں انتظام ہو گا اور ان کی ضروریات، اور ان کی دل چسپی کے بھی، جملہ لوازم وہاں

موجود ہوں گے۔"

"سینما ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"ضرور ہوگا" انھوں نے جواب دیا "لیکن مخرب اخلاق فلمیں نہیں دکھلائی جائیں گی"

آج کے بنگلہ دیش میں یقیناً اس نوع کی ایک یونیورسٹی کی ضرورت اور گنجائش ہے، اور مولانا بھاشانی اس خدمت کو انجام بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ سیاست سے وہ کلّی طور پر علاحدہ ہو کر اسی یونیورسٹی کے ہو رہیں۔ مگر یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

"اس کام کے سلسلے میں ہمیں آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی" اسلامک یونیورسٹی ہی کے موضوع پر باتیں کرتے ہوئے مولانا بھاشانی نے کہا "آپ کے یہاں جو لوگ اس کام کے اہل ہوں، انھیں یہاں آنا چاہیے۔"

"پچھلے چوبیس برسوں میں جو لوگ یہاں آئے تھے" میں نے کہا "ان کا جو حشر ہوا، اس سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ اب یہاں کون آنے کی ہمّت کرے گا!"

"موجودہ صورت حال، عارضی ہے" مولانا نے جواب دیا "تین چار مہینوں میں ختم ہو جائے گی۔ آپ کو شاید یہ نہ معلوم ہو کہ یہاں کے دیہاتوں میں بہاریوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو رہی ہے۔ یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ ان پر بہت ظلم ہوا ہے۔ ان میں سے سب نے نہ تو پاکستانیوں کا ساتھ دیا تھا اور نہ سب نے پاکستانیوں کے ساتھ مل کر بنگالیوں کو لوٹا مارا تھا۔ جن لوگوں کے خلاف ثبوت ہو انھیں یقیناً سزا دی جائے لیکن ساری آبادی کو گردن زدنی قرار دینا انصاف کے خلاف ہے"

"بہاریوں کے ساتھ جو ہمدردی دیہاتوں میں پیدا ہو رہی ہے، اس کا یہ پہلو تشویش ناک ہے" مولانا بھاشانی ہی نے پھر رک کر کہا "اس ہمدردی کے جلو میں ہندو دشمنی بھی آرہی ہے، جس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ اس طرح کہ یہاں لوگ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بہاریوں کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کی اصلی ذمہ داری ہندستان کے ان فرقہ پرست ہندوؤں پر ہے، جو ایک طرف ہندستان میں 'بہاری بچاؤ سمیلن' کرتے تھے اور دوسری طرف بنگالیوں کی بہاری دشمنی کو ہوا دیتے تھے۔ بعض حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مغربی بنگال کی سیاسی پارٹیاں عوامی لیگ کو بہاری دشمنی پر اکساتی رہی ہیں۔

"پناہ گزینوں کی واپسی نے بھی کچھ باہمی منافرت ضرور پیدا کی ہے۔ جو جائیدادیں اور املاک چھوڑ کر وہ بھاگے تھے اور جس پر مقامی لوگ قابض ہو گئے تھے، اب حکومت وہ جائیدادیں اور املاک واپس دلا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے بھی لوگوں میں غم و غصہ پیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں، اور یہ سب مل ملا کر فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ فرقہ واریت میری فطرت کے خلاف ہے۔ میں ہمیشہ اس کا بدترین دشمن رہا ہوں۔ اس لیے میں اس صورتِ حال کو تشویش کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔"

"ان بہاریوں کو بہر حال یہیں رہنا ہوگا" مولانا بھاشانی نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا "پاکستان انھیں لینے پر تیار نہ ہوگا، ہندستان کے لئے یہ قابلِ قبول نہیں ہے، یہ آخر جائیں گے کہاں! اور یہ بھی ہے کہ ان کے بغیر ہمارا کام بھی نہ چلے گا۔ بنگالی انتہائی سست ہوتے ہیں (انھوں نے اس جگہ پر Lazy کا لفظ استعمال کیا تھا)۔ ان کے برعکس بہاری

محنتی اور مضبوط ہوتے ہیں۔

بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں مولانا بھاشانی کا اندازِ فکر عام بنگالیوں سے کچھ مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات دوستانہ ہونا چاہئیں۔

"پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہوتا، تو صورتِ حال بدل جاتی" انھوں نے مجھ سے کہا "تجارت کے میدان میں ہم ایک دوسرے کے لیئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"اگر امریکا اور انگلستان کے بینک یہاں کام کر سکتے ہیں" میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا بھاشانی نے کہا "تو حبیب بینک اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی شاخیں یہاں کیوں نہ قایم ہوں۔ پاکستان جتنی جلد بنگلہ دیش کو تسلیم کرلے اسی قدر دونوں ملکوں کے لیے بہتر ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی رشتے قایم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے کارخانوں کے لئے روئی کی ضرورت ہے، جو پاکستان آسانی سے مہیا کر سکتا ہے۔ پاکستان کو پٹسن درکار رہے، جو ہم بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ فراہم کر سکتے ہیں۔"

مولانا بھاشانی کا یہ بھی خیال ہے کہ پاکستان کے بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ سیاسی و معاشی میدان میں آج صرف ہندستان اور سوویٹ یونین ہی بنگلہ دیش پر چھائے ہیں۔ امریکا نے بعد از خرابی بسیار بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے۔ اسی طرح اگر پاکستان بھی کرے، تو یہاں کی سیاسی آب و ہوا میں ایک طرح کا توازن پیدا ہو جائے۔"

"موجودہ حکومت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے سوال کیا

"بنگلہ دیش کی موجودہ حکومت کے بارے میں یقیناً میری رائے اچھی نہیں ہے،" انھوں نے جواب دیا "لیکن میں ابھی اسے مہلت دینا چاہتا ہوں"

"لیکن آپ نے تو پلٹن میدان کی تقریر میں حکومت پر جس لب و لہجے میں نکتہ چینی کی تھی اسے تو شدید مخالفت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"

"یہ کچھ حد تک صحیح ہے۔ میں حکومت کی کڑی نکتہ چینی کرتا ہوں، اور یہ میں کرتا رہوں گا۔ کیوں میں ہی اکیلا اپوزیشن میں ہوں۔ باقی سب تو حکومت کی ہم نوائی کر رہے ہیں حکومت کی غلط پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں ہے" مجیب کے چار خلیفہ کا ذکر ہر شخص کرتا ہے، لیکن کسی میں بھی اتنی جرات نہیں ہے کہ ان کے خلاف زبان کھولے۔"

مولانا بھاشانی کو یہ بھی شکایت ہے کہ حکومت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے، اگرچہ آزادی کی "اصلی لڑائی تو ان لوگوں نے لڑی تھی، جو بنگلہ دیش میں تھے۔ اور ان میں اکثریت ہمارے لوگوں کی تھی، انھوں نے اپنی جانیں دی ہیں" لیکن حکومت کی کرسیوں پر وہ بیٹھے ہیں جو "بالی گنج (کلکتہ) میں بیٹھے تھے، اور لمبی لمبی تنخواہیں وصول کر رہے تھے"

شیخ مجیب الرحمان کو سرکاری طور پر بنگلہ دیش کا "راشٹر پتا" تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا بھاشانی کے ہم نواؤں کا خیال ہے کہ اس اعزاز کے مستحق مجیب نہیں بھاشانی ہیں۔ ان کے ایک ساتھی نے کہا کہ "مجیب اگر بنگلہ دیش کے "راشٹر پتا" ہیں تو بھاشانی کو بنگلہ کے "راشٹر دادا" کہنا چاہئے" اسی شکایت کا اظہار کرتے ہوئے خود مولانا بھاشانی نے بھی پلٹن میدان کی تقریر میں طنزاً کہا تھا کہ "مجیب اب بھائی نہیں رہے، باپ بن گئے ہیں"۔

یہ تھا مولانا بھاشانی سے میری دوسری طویل ملاقات کا خلاصہ۔ تین بجے میں نے مولانا کو یاد دلایا کہ اب مجھے واپس جانا ہے۔ ٹانگیں سے آخری بس چار بجے روانہ ہوتی

ہے۔ مولانا کا اصرار تھا کہ آج رات میں یہیں قیام کروں۔ لیکن میں تیار نہ ہوا سو تین بجے سنتوش سے روانہ ہو کر پونے چار بجے کے قریب ٹانگیل پہنچا۔ بس اسٹینڈ پر معلوم ہوا کہ آخری بس آج نہ جائے گی، کیوں کہ پٹرول نہیں ہے۔ مولانا نے اپنا ایک آدمی بھی ساتھ کر دیا تھا۔ اس نے بہت دوڑ دھوپ کی، مگر کسی اور سواری کا انتظام نہ ہو سکا۔ بالآخر پھر سنتوش لوٹنا پڑا۔ دوسرے دن سات بجے صبح کو پہلی بس سے روانہ ہو کر ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ڈھاکہ پہنچا۔

اس اتفاقی حادثے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کا اپنا آخری پروگرام میں پورا نہ کر سکا۔ ۱۲ اپریل کی صبح کے نو بجے رڈکراس کے بعض کارکنوں سے مجھے ملنا تھا۔ بس اسٹینڈ سے میں سیدھا رڈکراس کے دفتر گیا، لیکن معلوم ہوا کہ جن سے ملنا تھا، وہ لوگ میرا انتظار کرنے کے بعد باہر جا چکے ہیں۔"

۸

بنگلہ دیش کو آج جو بہت سے مسائل درپیش ہیں، ان میں ایک اہم ــــ بلکہ خاصا اہم ــــ مسئلہ اردو بولنے والی لسانی اقلیت کا ہے، جسے بنگلہ دیش کی ایک نسلی اقلیت کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس لسانی یا نسلی اقلیت کی یہ بدنصیبی تھی کہ اسے 'بہاری مسلمان' کا نام دے دیا گیا۔ بہاریوں اور بنگالیوں کی آویزش کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تقسیم سے قبل بھی بنگالی بہاری کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ بہاریوں کا بھی یہی حال تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس آویزش نے خطرناک شکل اختیار کرلی۔ بنگلہ دیش کی ساری غیر بنگالی آبادی کو چوں کہ بہاری کہا جانے لگا تھا، اس لئے تمام غیر بہاری تارکین وطن کے ساتھ بھی 'بہاریوں' ہی کا سا سلوک کیا گیا۔

"کتنے بہاری ہیں بنگلہ دیش میں؟" ایک بنگلہ دیشی کمیونسٹ سے میں نے پوچھا۔

"اس کا صحیح جواب نہ تو بنگلہ دیشی حکومت کے پاس ہے" اس نے جواب دیا "اور نہ خود بہاریوں کے پاس۔ بعض لوگوں کے تخمینے کے مطابق ان کی تعداد بیس لاکھ کے اردگرد رہی ہوگی۔ ان میں مہاراشٹر اور گجرات کے بھی تھے، حیدرآباد اور مدراس کے بھی، بہار اور یوپی کے بھی ــــ یہ سب اپنا اپنا کلچر اور اپنی اپنی زبانیں بھی ساتھ لائے تھے۔ یوپی اور بہار سے آنے والوں کی زبان اردو تھی۔ گجرات، مہاراشٹر، حیدرآباد اور مدراس سے

آنے والے بھی چوں کہ اردو بولتے اور سمجھتے تھے، اس لئے وہ سب ایک ہو گئے۔ ہندستان سے ترک وطن کر کے آنے والوں میں بڑی اکثریت چوں کہ بہار سے آنے والوں کی تھی، اسی مناسبت سے تمام تارکین وطن کو 'بہاری' کہا جانے لگا۔"

"یہ بہاری مسلمان؟" ایک نوجوان بنگلہ دیشی نے مجھ سے کہا "ان سے ہمیں کیوں کر ہمدردی ہو سکتی ہے! پچھلے چوبیس برسوں میں انھوں نے ہر موقع پر پاکستانیوں ہی کا ساتھ دیا اور اس دیس کے اصلی باشندوں کی مخالفت کی۔ پاکستانی حکومت کا آلہ کار بن کر انھوں نے بنگلہ زبان اور بنگلہ کلچر کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، اور بنگلہ دیشی قوم کو حقیر و ذلیل سمجھا۔ قیام پاکستان کے بعد بنگلہ دیش کی زبان کے حق کو نظر انداز کر کے جب پاکستان کی حکومت نے اردو کو قومی زبان قرار دیا، تو بنگالیوں نے اپنی زبان کا جائز حق منوانے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اس موقع پر بہاری کھل کر میدان میں آگئے اور پاکستانی حکومت کی پر زور حمایت کی۔ اس کے ساتھ ہی بہاری اور بنگالی دو محارب پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اس تجربے نے پاکستانی ارباب حکومت کو اس کا یقین دلا دیا کہ مشرقی پاکستان میں ان کے جملہ مفادات کو 'بہاریوں' ہی سے تقویت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں بہاریوں کو وہی مراعتیں حاصل ہونے لگیں اور انھیں وہی درجہ ملنے لگا جو آزادی سے قبل اینگلو انڈین طبقے کو پورے ہندستان میں حاصل تھا۔

"تقسیم کے بعد ہندستان سے ترک وطن کر کے مشرقی پاکستان آنے والے مسلمانوں کو پاکستانی حکومت نے کبھی بھی بنگالی آبادی کے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع نہ دیا۔" ایک بنگلہ

دیشی خاتون نے کہا "ان کے لیے الگ کالونیاں بنائیں اور ہر ممکن کوشش کی کہ بنگالی و بہاری ایک دوسرے کے حریف بنے رہیں۔ پورے بنگلہ دیش میں بہاریوں کی آبادی کا تناسب دو ڈھائی فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا، لیکن پاکستانی حکومت نے اس قلیل اقلیت کو عظیم اکثریت کا مدمقابل بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بہاریوں کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے نام پر بنگالیوں کے حقوق و مفاد کا خون کیا گیا۔ پچھلے سال مارچ میں جب شیخ مجیب الرحمان اور یحیٰی خاں میں گفت و شنید ہو رہی تھی تو مصالحت کی اس گفتگو کو یکایک ختم کرنے کے لیے بھی یحیٰی خاں نے بہاری مسلمانوں کے قتل و غارت کا جھوٹا عذر ہی نہیں تراشا بلکہ پورے بنگلہ دیش میں خون کی ندیاں بہادیں۔ مارچ سے دسمبر تک جب کہ بنگلہ دیش میدان کارزار بن گیا تھا، تو بنگلہ دیش کی بہاری آبادی نے یا تو پاکستانی فوجوں کے ساتھ تعاون کیا یا بنگالیوں کے قتل و غارت کے خاموش تماشائی بنے رہے۔"

"سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی" ایک بہاری دوست نے کہا، جو یوپی کے رہنے والے ہیں "ہم نے تقسیم کے وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا بھی ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا ہے۔ اور اپنے باپ دادا کی ڈیوڑھی چھوڑ کر ہم بھی نکل کھڑے ہوئے۔"

"تم جانتے ہو کہ بنگلہ دیشیوں کو تم سے کیا شکایتیں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"تم کو تو ابھی یہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ میں تو بیس برس سے یہاں ہوں۔ آج جو کچھ سامنے آیا ہے، اور جو کچھ آئندہ آئے گا، مجھے سب کا احساس اور علم تھا۔ میں دوستوں کو سمجھاتا تھا، لیکن وہ تو پاکستانی حکومت اور پاکستانی فوج کے زعم میں اکڑے ہوئے تھے۔ بنگلہ دیشیوں کی شکایتیں سو فی صدی صحیح ہیں۔ ہم سب بنگالیوں

کی نظروں میں پاکستانی سامراج کا جیتا جاگتا نشان بن گئے تھے۔ اس لیے بنگالی ہم سے نفرت کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔"

"لیکن مجھے بنگلہ دیشیوں سے ایک شکایت ہے" ایک دوسرے بہاری دوست نے کہا" اور وہ یہ ہے کہ بہاریوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو پاکستان کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ جنھیں بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی سے ہمدردی تھی اور جنھوں نے ان کی مدد بھی کی تھی، بنگالیوں کو بچایا بھی تھا، لیکن انھیں بھی آج مجرم سمجھا جا رہا ہے۔"

یہی بات مولانا بھاشانی نے بھی اپنی تقریر میں کہی تھی۔ انھوں نے جب یہ مطالبہ کیا تھا کہ بلا مقدمہ چلائے ہوئے کسی کو جیل میں بند نہ کیا جائے، تو ان کا اشارہ بہاری مسلمانوں ہی طرف تھا۔

بنگلہ دیش کے جن مسایل کو، بنگلہ دیش پہنچنے کے بعد میں سمجھنا چاہتا تھا، ان کی ایک فہرستِ دہلی سے روانگی کے وقت میں نے بنائی تھی۔ 'بہاری مسلمانوں' کا مسئلہ اس فہرست میں چوتھے نمبر پر تھا۔ لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ڈھاکہ پہنچنے کے پہلے ہی دن بنگلہ دیش کا جو مسئلہ میرے سامنے آیا وہ، بالکل غیر متوقع طور پر، 'بہاریوں' ہی کا مسئلہ تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ تھی کہ اس مسئلے کا جو پہلو میرے سامنے آیا، اس کی طرف اب تک کسی نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس کا تعلق کسی 'بہاری مسلمان سے نہیں، بلکہ ایک بہاری ہندو سے تھا۔

اپنی قیام گاہ تک جانے کے لیے سفارت خانے کی جو گاڑی مجھے ملی تھی، اس کے

ڈرائیور کا نام رام سنگھ تھا۔ اس کا نام اور اس کا لب ولہجہ مجھے غیر بنگالی سا معلوم ہوا۔

"کہاں سے آئے ہیں آپ" ڈرائیور نے سوال کیا۔

"دہلی سے"

"ہندستانی ہیں آپ؟"

"ہاں میں ہندستانی ہوں، اور تم؟"

"میں تو بنگلہ دیشی ہوں" اس نے جواب دیا "لیکن یہاں والے کہتے ہیں کہ اپنے دیس واپس جاؤ"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی کے ساتھ سوال کیا "تمہارا دیس کہاں ہے؟"

"میں تو یہیں پیدا ہوا، لیکن میرا باپ اتر پردیش کے اعظم گڑھ ضلع کا رہنے والا تھا۔ اب سے کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے جب دیس بٹا نہیں تھا، تو چائے کے کسی باغ میں نوکری کرنے کے لئے میرا باپ آسام آیا تھا۔ پھر کسی انگریز کے ساتھ وہ ڈھاکہ آگیا۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے چھوٹے بھائی اور میری ماں کو بھی ڈھاکہ لے آیا۔ میں یہیں پیدا ہوا اور میرے تین بھائی بہن بھی یہیں پیدا ہوئے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم مڑوا ہو، اپنے دیس واپس جاؤ"

"یہ مڑوا کیا ہے؟"

"جو لوگ بنگالی نہیں ہیں اور اردو یا ہندی بولتے ہیں، انھیں یہاں مڑوا[1] کہتے ہیں۔"

---

[1] بعض بنگلہ دیشی دوستوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ غیر بنگالیوں کو یہاں مڑوا کہا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کے صحیح معنی وہ بھی نہ بتا سکے غالباً یہ "ماڑواڑی" سے مشتق ہے۔

بنگلہ دیش کی اس لسانی یا نسلی اقلیت کے مسئلے سے متعلق جتنے پہلو بھی اب تک سامنے آئے تھے، ان کا تمام تر تعلق صرف 'بہاری' مسلمانوں ہی سے تھا، لیکن بنگلہ دیش میں اتر پردیشی رام سنگھ کے وجود سے پیدا ہونے والے مسئلے نے اس سوال کی نوعیت کو یک سر بدل دیا۔ دو تین دن کے بعد جب رام سنگھ کا اور میرا دوبارہ ساتھ ہوا، تو اس سوال کو میں نے پھر چھیڑا۔

"رام سنگھ تم تو ہندو ہو" میں نے سوال کیا "اور بنگلہ بھی بولتے ہو۔ تم سے یہ لوگ جانے کے لئے کیوں کہتے ہیں؟"

"صاحب یہ ہندو مسلمان کا سوال نہیں ہے" اس نے جواب دیا "یہ بنگالی غیر بنگالی کا جھگڑا ہے۔"

"تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے، یہ جھگڑا خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔"

"یہ جھگڑا ختم ہونے کا نہیں" رام سنگھ نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا "یہ روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے تو ہماری نوکریاں بھی ان ہی کو مل جائیں گی یہاں ہمارا رہنا اب ممکن نہیں ہے۔ ہم بھی اب یہاں رہنا نہیں چاہتے۔ ہم سب اپنے دیس واپس چلے جائیں گے"

"تم کب سے نہیں گئے ہو اعظم گڑھ؟"

"میں تو صاحب کبھی گیا ہی نہیں ہوں" تیس پینتیس سال ہوئے میرا باپ البتہ ایک مرتبہ گیا تھا۔ یہ میری پیدائش سے پہلے کا قصہ ہے۔

"تمہارے کچھ رشتے دار تو وہاں ہوں گے؟"

"مجھے اپنے کسی رشتے دار کا پتا نہیں۔ معلوم نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں؟ اور ہے بھی تو ہمیں پہچانے گا بھی یا نہیں؟"

"تم کیا کروگے وہاں جاکر؟"

"جو یہاں کرتا ہوں، وہی وہاں کروں گا۔ اپنا دیس ہے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔ میں تو ذات کا مالی ہوں، پھول چن کر پیٹ پال سکتا ہوں"

اعظم گڑھ ہی کے ایک 'بہاری مسلمان'، علی اوسط سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رام سنگھ کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک بڑے سرکاری عہدے پر تھے، بلکہ اب بھی ہیں۔ اگرچہ پچھلے تین مہینے سے رخصت لیے ایک جگہ چھپے بیٹھے ہیں۔ ان سے تو نہیں، لیکن ان کے بعض عزیزوں سے میں واقف ہوں۔ ان کے مسایل بھی رام سنگھ کے مسایل سے قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ وہ بھی رام سنگھ ہی کی طرح 'اپنے دیس'، واپس لوٹنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن رام سنگھ ہی کی طرح انھیں بھی اپنے کسی عزیز یا رشتے دار کا پتا نہیں معلوم ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کی یہ آرزو اگر پوری بھی ہو جائے تو وہ کہاں جائیں گے، کس سے ملیں گے، کہاں رہیں گے!

رام سنگھ اور علی اوسط کی رام کہانی ایک ہی ہے۔ بس فرق صرف دو باتوں میں ہے۔ ایک تو یہ کہ رام سنگھ کے پاس تھا ہی کیا جو لٹتا۔ علی اوسط کے پاس بہت کچھ تھا، جو لٹ گیا۔ تھوڑا بہت اثاثہ جو بچا تھا وہ دوستوں کے یہاں رکھ دیا تھا، وہ ان ہی کی نذر ہو گیا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ رام سنگھ کو اپنے دیس واپس جانے کی آرزو ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے جانے کا یقین بھی ہے، لیکن علی اوسط کو صرف آرزو ہی ہے، یقین تو درکنار توقع بھی نہیں ہے۔

۹

بنگلہ دیش میں چار سیاسی پارٹیاں قانونی حیثیت رکھتی اور آزادانہ کام کر رہی ہیں۔ عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی (مظفر گروپ)، کمیونسٹ پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ)۔

بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے قبل کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ ماسکو سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ، پروفیسر مظفر احمد کی نیشنل عوامی پارٹی میں اور پی کنگ سے واسطہ رکھنے والے کمیونسٹ، مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ گویا نیشنل عوامی پارٹی ہی عملاً کمیونسٹ پارٹی تھی۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آتے ہی کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹالی گئی۔ یہ دائیں بازو کی پارٹی اور ماسکو کی ہم نوا ہے۔ بنگلہ دیش میں اس کی وہی حیثیت ہے جو ہندستان میں دائیں بازو کی کمیونسٹ پارٹی کی ہے۔ اس کی رہنمائی کی خدمت بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ہی انجام دیتی ہے۔ ڈھاکہ میں اس کا باضابطہ دفتر قایم ہے اور دوسرے مقامات پر اس کی شاخیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن مظفر احمد کی نیشنل عوامی پارٹی اور بنگلہ دیش کی کمیونسٹ پارٹی نظریاتی اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

بنگلہ دیش کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کامریڈ مونی سنگھ مولانا بھاشانی کے

بعد بنگلہ دیش کے سب سے زیادہ آزمودہ کار لیڈر رہیں۔ ان کی پیدائش کا سن ۱۹۰۱ء ہے۔ اس حساب سے اس وقت ان کی عمر ۷۱ سال ہے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہمارے ملک کی دہشت پسند کمیونسٹ تحریک سے ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں جن دہشت پسندوں نے چٹ گام کے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا تھا، ان میں مونی سنگھ بھی شامل تھے۔ اسی وقت سے ان کی قید و بند کی زندگی کا آغاز ہوا، اور پھر اس کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گزرا۔ تقسیم کے بعد وہ مشرقی پاکستان ہی میں رہے، اور بیس سال تک خفیہ طور پر (underground) کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں گرفتار ہوئے اور پھر ۷۱ء تک جیل ہی میں رہے۔ ان کا تعلق ایک بڑے زمیندار خاندان سے ہے، لیکن برطانوی عہد ہی میں ان کی پوری زمینداری ضبط کرلی گئی تھی۔ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے والے اکثر کمیونسٹوں کے برعکس کامریڈ مونی سنگھ کے فکر و عمل میں جاگیردارانہ ورثے کے اثرات نظر نہیں آتے۔

"بنگلہ دیش کی حکومت کی سوشلزم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بنگلہ دیش کی حکومت نے سوشلزم ہی کو نہیں سائنٹی فک سوشلزم کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔ بنگلہ دیش میں آج جو ہواؤں کا رُخ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکومت اگر سوشلزم کے راستے سے ہٹنا بھی چاہے تو ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔"

"مجیب کا بڑا کارنامہ یہ ہے" میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا "مجیب نے کمیونل (فرقہ وارانہ) گورن منٹ کی جگہ پر نیشنل گورن منٹ بنائی ہے۔"

"نیشنل گورن منٹ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"سیاسی اصطلاح کے طور پر نیشنل گورن منٹ کا لفظ میں نے استعمال نہیں کیا

ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی موجودہ حکومت کسی ایک فرقے کی حکومت نہیں ہے، بلکہ یہ بنگلہ دیش کے کل فرقوں کی حکومت ہے"۔

"بنگلہ دیش میں رجعت پرستوں کی بھی کمی نہیں ہے"، انھوں نے ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہا "پاکستان کے دور میں یہ علانیہ کام کرتے تھے، ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ لیکن آج صورت حال بالکل مختلف ہے۔ فرقہ وارانہ پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس سے ان کا وجود ختم نہیں ہوا ہے۔ اس طرح کی تمام پارٹیاں منظم ہو رہی ہیں"

نیشنل عوامی پارٹی کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ ۱۹۴۹ء میں شہید سہروردی نے ایک عوامی پارٹی بنائی جسے مولانا بھاشانی کا تعاون حاصل تھا۔ مسلم لیگ کی حکومت نے اس کی شدید مخالفت کی، لیکن اس سے عوامی پارٹی کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔ ابتدائی دور میں یہ ایک ترقی پسند پارٹی تھی، لیکن سہروردی جب پاکستان کے وزیر اعظم بنے تو اپنی داخلی اور خارجی سیاست میں وہ اپنے پیش رو حکمرانوں سے بھی آگے نکل گئے۔ اسی بنا پر مولانا بھاشانی نے سہروردی کی پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر کے نیشنل عوامی پارٹی کی داغ بیل ڈالی، جو جلد ہی مشرقی پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے پاکستان میں سب سے بڑی سامراج دشمن پارٹی بن گئی۔ ۱۹۶۶ء میں جب ماسکو اور پی کنگ کے اختلافات نے علانیہ جنگ کی شکل اختیار کر لی اور دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیاں دو محارب گروہوں میں بٹ گئیں، تو نیشنل عوامی پارٹی کے بھی دو حصے ہو گئے۔ ایک کے ساتھ "مظفر گروپ" کا اور دوسرے کے ساتھ "بھاشانی گروپ" کا اضافہ ہو گیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں حصوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر حصہ نہیں لیا، اور انھوں نے شیخ مجیب الرحمان کی عوامی پارٹی کی حمایت کی۔ ۱۹۷۱ء میں جب باضابطہ جنگ شروع ہوئی تو اس وقت بھی نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں حصوں نے بنگلہ دیش کو آزاد کرانے میں غیر مشروط طور پر عوامی لیگ کے دوش بدوش کام کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مجیب نگر میں جب بنگلہ دیش کی حکومت بنی، تو اس وقت بھی سارے گروہوں کی خواہش تھی کہ عوامی لیگ ہی کی نہیں، بلکہ تمام پارٹیوں کی نیشنل گورنمنٹ بنائی جائے۔ اور آج بھی ان کا یہی مطالبہ ہے۔ کامریڈ مونی سنگھ اور مظفر حسین نے براہ راست اور مولانا بھاشانی نے بالواسطہ نیشنل گورنمنٹ کے قیام کی ضرورت کا اظہار کیا۔

اس مطالبے کی پشت پر یہ استدلال کام کر رہا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوامی لیگ کو یقیناً غیر معمولی اکثریت ہوئی تھی۔ لیکن آزاد بنگلہ دیش کی گورنمنٹ بنانے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ موجودہ حکومت بنگلہ دیش کی جائز قانونی حکومت نہیں ہے۔ پروفیسر مظفر احمد اور مولانا بھاشانی نے تو بہت پہلے ایک ایسی عارضی قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ بھی کیا تھا، جو ان سب پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو جنھوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ لیکن ملک کو جن غیر معمولی حالات کا سامنا تھا، ان کے پیش نظر برسر اقتدار پارٹی نے اس مطالبے کو قبول کرنا مناسب نہ سمجھا، بلکہ خود مظفر اور بھاشانی نے بھی وقتی طور پر اس مطالبے پر زور دینا مصلحت کے خلاف سمجھا اور انھوں نے موجودہ حکومت کی غیر مشروط تائید کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

"شیخ مجیب اور ان کی پارٹی جن غیر معمولی حالات کی بنا پر قومی حکومت کا قیام خلاف

مصلحت سمجھتی ہے" ایک صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے کہا "دراصل ان ہی حالات کا تقاضا ہے کہ ملک میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آئے۔"

"عوامی لیگ نے غیر معمولی اکثریت کے زعم میں قومی حکومت کے مطالبے کو قبول نہ کیا" ایک دوسرے صاحب نے کہا "اور وہ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے بھول گئی کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسے اتنی بھاری اکثریت خود اس کی مقبولیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ملک کی تمام ترقی پسند پارٹیوں کی متحدہ کوششوں کی بنا پر حاصل ہوئی تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی نے، اور اس کے سربراہ مولانا بھاشانی نے، انتخابات کے اکھاڑے میں اترنے کی جگہ پر، عوامی لیگ کے لیے ارادتاً میدان چھوڑ دیا تھا اور اس کی پوری حمایت ہی نہیں، ہر ممکن مدد بھی کی تھی۔"

"بنگلہ دیش کے موجودہ مسایل کو کوئی بھی پارٹی گورنمنٹ حل نہیں کر سکتی" ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے مجھ سے کہا "داخلی امن کا مسئلہ ہو یا ضروریات زندگی کی چیزوں کی گرانی و کم یابی کا یا اسی طرح کے اور مسایل کا، وہ کوئی پارٹی بھی، خواہ اسے کتنی ہی مقبولیت کیوں نہ حاصل ہو، یکہ و تنہا حل نہیں کر سکتی۔ اس کی ذمہ داری تمام پارٹیوں کو مشترکہ طور پر لینا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں عوامی لیگ کی حکومت کی جو پالیسی ہے، اس کا اندازہ آج سے ڈھائی تین ہفتہ پہلے کے اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈھاکہ کے ایک انگریزی روزنامے نے جب قومی حکومت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ایک پُرزور اور مدلّل اداریہ شائع کیا، تو اس کی اشاعت کے تیسرے ہی دن اس اخبار کے اڈیٹر کو "خرابی صحت" کی بنا پر ادارت کے عہدے سے دست بردار ہونا پڑا۔"

ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک اور پروفیسر جو اس گفتگو کے وقت موجود تھے انھوں نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"آج بنگلہ دیش کا سب سے بڑا مسئلہ داخلی امن و امان کا ہے، جو سدھرنے کی جگہ پر بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ آج بنگلہ دیش میں عام لوگوں کے پاس کتنے ہتھیار ہیں، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔"

"اس موضوع پر ہر پارٹی کے لوگوں سے میں نے باتیں کی ہیں" میں نے کہا "اور ان کے تخمینے کے مطابق ۵۰ فی صدی سے ۳۰ فی صدی تک اسلحہ لوگوں نے واپس کئے ہیں۔ عوامی لیگ کے لیڈروں کے بیان کے مطابق جنوری ۱۹۷۲ء میں جتنے اسلحہ مختلف مکتی بہنیوں اور دوسرے لوگوں کے پاس تھے اس کے نصف واپس ہو گئے ہیں۔ مظفر گروپ کا اندازہ ہے ۴۰ فی صدی واپس ہوئے ہیں۔ بھاشانی گروپ کا کہنا ہے کہ صرف ۳۰ فی صدی اسلحہ گورنمنٹ کو واپس ملا ہے۔"

"اس کے معنی یہ ہوے" اسی پروفیسر نے کہا "عوامی لیگ کے پاس پچاس فی صدی، مظفر گروپ کے پاس ساٹھ فی صدی اور بھاشانی گروپ کے پاس ستر فی صدی اسلحہ ابھی موجود ہیں، اور یہ وقت ضرورت استعمال کئے جا سکتے ہیں۔"

"وقت ضرورت سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر نیشنل گورنمنٹ نہ بنی تو ان سب پارٹیوں میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گی، جو خانہ جنگی کی شکل اختیار کرے گی اور اس وقت ہر پارٹی اسی اندوختے سے کام لے گی۔"

"کیا خانہ جنگی کا واقعی کوئی امکان ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں اس کے امکان، بلکہ قوی امکان، سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہ خانہ جنگی اگر شروع ہوئی" میں نے کہا "تو ایک طرف عوامی لیگ ہو گی اور اس کے ساتھ مظفر

کی نیشنل عوامی پارٹی، دائیں بازو کی کمیونسٹ پارٹی اور چھاتر لیگ (Students League) ہوگی، دوسری طرف بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی اور اس ساتھ، بلا تفریق نظریات، عوامی لیگ کی تمام مخالف پارٹیاں — جن میں بائیں بازو کے کمیونسٹ اور نکسلائٹ سے لے کر سابق جماعت اسلامی و مسلم لیگ جیسی رجعت پرست پارٹیاں بھی — شامل ہوں گی"

"لیکن میرا گمان ہے" پروفیسر نے کہا "یہ شکل خانہ جنگی کے آخری دور، فائنل راونڈ (final round) کی ہوگی۔ پہلے دور کا آغاز خود عوامی لیگ ہی کے داخلی تصادم سے ہوگا۔ بہ ظاہر یہ جتنی متحد نظر آتی ہے، اس سے کہیں زیادہ شدید نظریاتی تضاد کا شکار ہے، جو کسی وقت بھی باہمی افتراق ہی کا نہیں، مسلح تصادم کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہی بات بنگلہ دیش چھاتر لیگ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جو عوامی لیگ کے اقتدار کا سب سے بڑا ستون ہے، جس پر مجیب کے چار خلیفہ — عبد الرب، نور عالم صدیقی، عبد القدوس مکھن، اور شاہ جہاں شیراز چھائے ہیں۔ اسی سلسلے میں سراج العالم خاں کا بھی نام لینا چاہیئے، جو چھاتر لیگ میں سب سے زیادہ با اثر حیثیت کے مالک ہیں۔ یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ عوامی لیگ ہی کی طرح چھاتر لیگ بھی سائنٹی فک سوشلزم کی زبردست علم بردار ہے، لیکن عوامی لیگ ہی کی طرح اس کی قیادت میں بھی ماسکو ہی کے نہیں، واشنگٹن، پی کنگ اور لندن کے اجنٹ بھی شامل ہیں۔ کشمکش یا تصادم کا آغاز چھاتر لیگ سے بھی شروع ہو سکتا ہے، جو عوامی لیگ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔"

"آپ حضرات اجازت دیں تو ایک بات میں بھی عرض کروں"، ایک نوجوان نے کہا، جو ہماری گفتگو کے دوران میں آیا تھا اور خاموشی سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔

"یہ ایک نوجوان طالب علم ہیں"، پروفیسر نے ان کا تعارف کرایا "چھاتر لیگ کے سرگرم

ممبر ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ بنگلہ دیشی کمیونسٹ ہیں اور ان کا تعلق ماسکو، پی کنگ یا واشنگٹن سے نہیں، صرف ڈھاکہ سے ہے۔

"یہ سچ ہے کہ بارود کے ایک بہت بڑے امبار پر ہم بیٹھے ہیں اور دیا سلائی کی ایک تیلی سے پورا بنگلہ دیش اڑ سکتا ہے۔" نوجوان طالب علم نے کہا "لیکن ہم ایسا نہ ہونے دیں گے۔ جس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے اتنی قربانیاں کی ہیں، اسے ہم ہرگز جانے نہ دیں گے۔ ہم خانہ جنگی نہیں چاہتے۔ ہمیں آج سب سے زیادہ امن کی ضرورت ہے ـــــ داخلی امن کی، ہماری منزل بنگلہ دیش کی تعمیر نو ہے، جو خانہ جنگی کی فضا میں نہیں، امن کے ماحول ہی میں طے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اپنی آزادی کو بچانے اور اپنے آدرشوں کے تحفظ کے لیے اگر ضرورت ہوئی تو ہم خانہ جنگی سے بھی پیچھے نہ ہٹیں گے۔"